حقیقتِ ایمان

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

حقیقت ایمان

بانی تنظیم اسلامی، داعیٔ تحریک خلافت اور

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد

کے ⑤ خطبات جو انجمن کے سالانہ محاضراتِ قرآنی ۱۹۹۱ء میں دیئے گئے۔

تسوید و ترتیب : مولانا ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

مکتبہ خُدّام القرآن لاھور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون:03-5869501

نام کتاب ——————— حقیقت ایمان
طبع اوّل (فروری 2003ء) ——————— 2200
طبع دوم (اگست 2004ء) ——————— 2200
ناشر ——— ناظم نشر و اشاعت' مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقامِ اشاعت ——————— 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور
فون: 03-5869501
مطبع ——————— شرکت پرنٹنگ پریس' لاہور
قیمت (اشاعت خاص) ——————— 120 روپے
(اشاعت عام) ——————— 60 روپے

ترتیب

باب چہارم: قانونی اور حقیقی ایمان کا فرق

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

تقدیم

یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام کی بنیاد ایمان ہے۔ لیکن اس سے آگے یہ امور کہ ایمان کے لفظی معنی کیا ہیں؟ —— اس کا اصطلاحی مفہوم یا ''تعریف'' کیا ہے؟ پھر یہ کہ اسلام کن کن حقائق کے تسلیم کرنے کا نام ہے؟ —— اور یہ امور کس طرح ایک مکمل World View اور Weltenschuong اور Ideology یا عرف عام کے مطابق ''فلسفہ'' کی صورت اختیار کرتے ہیں؟ —— پھر یہ اہم اور پیچیدہ بحث کہ ایمان کا عمل کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ —— اور اس کے ضمن میں امت کے مختلف مکاتب فکر میں کیا کیا اختلافات واقع ہوئے ہیں؟ —— اور ان اختلافات کی تحلیل و تصفیے کی کیا صورت ہے؟ —— اور بالآخر یہ کہ ایمان کا حاصل کیا ہے؟ —— اور اس کے ضمن میں ذاتی سطح پر اعمال صالحہ اور قلبی و ذہنی اطمینان وسکون پر مستزاد اجتماعی طور پر جہاد فی سبیل اللہ کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ —— ان امور پر نہ عوامی سطح پر کوئی توجہ ہی دی جاتی ہے' نہ کوئی آسان لیکن مربوط و مبسوط کتاب کم از کم اردو زبان میں میری محدود معلومات کی حد تک موجود ہے —— جبکہ دوسری طرف اسی کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور گزشتہ صدی کی احیائی تحریکوں کی ناکامی کا اصل سبب یہی ہے کہ ان میں مسلمانوں کی حد تک ایمان کو تو Taken for Granted کے انداز میں موجود مان لیا گیا اور ساری بحث اسلام کے انفرادی اور اجتماعی سطحوں پر عملی مظاہر پر مرکوز کر دی گئی!

راقم الحروف کو اس کا شدید احساس شروع سے تھا۔ چنانچہ یہ موضوع میرے دروسِ قرآن اور خطاباتِ عام میں تو بکثرت زیر بحث آیا' اور اس پر ۱۹۹۱ء کے سالانہ قرآنی محاضرات میں مَیں نے پانچ خطبات بھی دیئے —— لیکن تا حال اس موضوع پر کوئی تحریر سامنے نہیں آ سکی تھی' چنانچہ اس کے لئے میں نے اولاً ان خطبات کو کیسٹ کی

ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرایا اور پھر محترم مولانا ابوعبد الرحمٰن شبیر بن نور سے درخواست کی کہ انہیں مرتب کرلیں۔ موصوف ایک مستند عالم دین' اور عربی لغت اور گرامر کے جید ماہر ہیں جو عرصہ سے سعودی عرب میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں ـــــ انہوں نے بڑی خوشی کے ساتھ میری اس درخواست کو قبول کرلیا ـــــ اور کچھ عرصہ کے بعد اس کی اقساط بھجوانی شروع کردیں جو ماہنامہ ''حکمت قرآن'' میں شائع بھی ہوتی رہیں۔ لیکن بعض وجوہ سے مجھے ان کے طرزِ ترتیب سے بتمام وکمال اتفاق نہ ہوسکا اور میں نے ارادہ کیا کہ اس پر خود نظر ثانی کروں۔ لیکن جب بھی ایسا ہوتا کہ میں اسے لے کر بیٹھتا تو مجھے ایک پہاڑ سا سامنے نظر آتا اور میں فائل بند کردیتا ـــــ تاہم چند روز قبل میں نے طے کیا کہ ایک مرتبہ اسے ''as it is'' شائع کردیا جائے ـــــ پھر اگر واقعی ضرورت محسوس ہوئی تو دوسرے ایڈیشن میں حک واضافہ کرلیا جائے گا!

میں مولانا شبیر بن نور کی محنت ومشقت کا تہہ دل سے قدردان ہوں ـــــ اور ان کا صمیمِ قلب کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں ـــــ خصوصاً اس بنا پر کہ انہوں نے یہ تمام محنت ومشقت خالصتاً لوجہ اللہ کی ہے اور کسی بھی طرح کا کوئی معاوضہ یا محنتانہ نہیں لیا۔ لہٰذا اگر اس کتاب سے خلقِ خدا کو کوئی فائدہ پہنچے تو اس کے اجر وثواب میں وہ میرے ساتھ برابر کے شریک ہوں گے۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

۵/فروری ۲۰۰۳ء

خطبۂ مسنونہ، آیاتِ قرآنی اور حدیث نبویؐ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ —— اَمَّا بَعْدُ :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم —— بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ ﴾ (الانعام : ۸۱-۸۲)

وقال تبارک و تعالٰی کما ورد فی اول سورۃ البقرۃ :

﴿ الٓمّٓ ○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ ﴾ (البقرۃ : ۱-۵)

وقال جلّ و علا کما ورد فی وسط السُّورۃ :

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ . . . ﴾ (البقرہ : ۱۷۷)

وقال تبارک و تعالٰی کما ورد فی آخر السُّورۃ :

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ○ ﴾ (البقرۃ : ۲۸۵)

و کان النبی ﷺ یقول عند رویۃ الھلال :

((اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ، رَبِّيْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ))

ترجمۂ آیاتِ قرآنی وحدیثِ نبوی ﷺ

"دونوں فریقوں میں سے کون امن اور بے خوفی و اطمینان کا زیادہ مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن انہی کے لئے ہے اور راہِ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔"

"الف' لام' میم۔ یہ "الکتاب" ہے' اس میں کوئی شک نہیں' ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا اس سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ ہی اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں"۔

"نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف' بلکہ نیکی اس کی ہے جو اللہ اور یومِ آخر اور فرشتوں کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے"۔

"رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسول کو ماننے والے ہیں انہوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کرلیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ "ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے' ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی' مالک! ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے"۔

"اے اللہ! اس ہلال کو امن و ایمان اور سلامتی و اسلام کا موجب بنا کر ہمارے لئے طلوع فرما' (اور اے چاند!) میرا اور تمہارا رب اللہ ہے"۔ [1]

---

1) سنن الترمذی' کتاب الدعوات' باب مایقول عنه رویه الهلال' حدیث ۳۴۵۱۔ المستدرك للحاکم ۲۸۵/۴۔ مسند احمد ۱۶۲/۱۔ سنن الدارمی ۴/۲۔ علامہ العصر جناب محمد ناصر الدین الالبانی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو سلسلة الاحادیث الصحیحة ۴۳۰/۴' حدیث ۱۸۱۶۔

باب اول

چند تمہیدی امور

خطبۂ مسنونہ 'مندرجۃ الصدر آیات قرآنی کی تلاوت اور ادعیۂ مسنونہ کے بعد :

آج سے ہم اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اس سال کے پانچ روزہ محاضراتِ قرآنی کا آغاز کر رہے ہیں جن کا مرکزی عنوان ہے : "حقیقت ایمان"۔

آج یہاں حاضر ہونے سے پہلے جب میں تمہیدی کلمات کے بارے میں سوچ رہا تھا تو سابقہ بیس پچیس سال پر محیط تاریخ کا نقشہ ایک فلم کی طرح پردۂ ذہن پر گھوم گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس عرصے میں دین کی خدمت کا جو بھی موقع میرے لئے میسر فرمایا اور جس ذہنی' فکری اور دعوتی تگ و دو کی توفیق میرے نصیب میں لکھی' خواہ یہ خدمت مرکزی انجمن خدام القرآن کے سٹیج سے ہوئی یا تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے' اس ساری محنت کے چار بنیادی موضوعات (Main themes) رہے ہیں :

① فرائض دینی کا جامع تصور

② اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی اور اس کے نمایاں خد و خال

③ منہج انقلابِ اسلامی

④ حقیقت ایمان

① فرائض دینی کا جامع تصور

ان میں سے اوّلین' اہم ترین اور ہر لحاظ سے بنیادی اور اساسی موضوع (Theme) "فرائض دینی کا جامع تصور" ہے۔ اس حوالے سے میں دیکھتا ہوں کہ

آج کل اخبارات میں ہمارا کچھ مذاق بھی اڑایا جارہا ہے' تاہم میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکرادا کرتا ہوں کہ یہ ہماری پہچان بن گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق کی بدولت میں نے اپنی توانائیوں کا بیشتر حصہ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب پر مبنی "فرائض دینی کا جامع تصور" کی وضاحت پر ہی صرف کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اسی جامع تصور کو ہی بنیاد بنا کر قرآن حکیم سے یہ منتخب نصاب مرتب کیا گیا ہے جس کے دروس کو ہماری اس تحریک کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے ــــــ مسخ شدہ طبیعتوں کا معاملہ بالکل مختلف ہے' عام طور پر انسان کی فکراور اس کے کردار کے مابین ایک لازمی تعلق ہوا کرتا ہے' چنانچہ نارمل حالات میں انسان کا عمل اس کی فکراور سوچ کے تابع ہوتا ہے۔ اب اگر "فرائض" کے بارے میں ہمارا تصور صحیح ہوجائے' یعنی اسلام کی آفاقی تعلیمات کے مطابق جامع اور ہمہ گیر ہوجائے تو یقیناً ہمارا عمل بھی درست' جامع اور ہمہ گیر ہوجائے گا۔ میں نے سب سے زیادہ محنت قرآن حکیم کے اسی منتخب نصاب کے بیان پر صرف کی ہے۔ بار بار ان مقامات کے درس دیئے ہیں' فرائض دینی کے اس جامع تصور کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے چالیس چالیس روزہ قرآنی کیمپ منعقد کئے ہیں' اس کے علاوہ سات سات اور دس دس دن کی تربیت گاہیں بھی منعقد کی ہیں۔ اپنے ملک پاکستان سے نکل کر ٹورنٹو اور شکاگو میں جاکر بھی یہ ذمہ داری ادا کی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ جہاں جہاں میں جاسکا اس فکر کو پہنچایا ہے' بلکہ دنیا کے اکثر و بیشتر حصوں میں یہ فکر آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کے ذریعے پہنچ رہا ہے۔

تصورِ فرائض دینی کے سلسلے میں سب سے زیادہ تاکیدی عنصر "فریضۂ اقامت دین" کا ہے۔ یہ وہ فریضہ ہے جسے ہم بحیثیت امت فراموش کرچکے ہیں اور اسی کو سب سے زیادہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تصور دراصل ایک دینی تحریک کا ورثہ ہے جس کے ساتھ میری گہری وابستگی رہی ہے۔ اسی تحریک نے مجھے یہ تصور دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ دینی تحریک خود موجودہ بے دین' ملحد جمہوری سیاست کی

دلدل میں پھنس چکی ہے اور نتیجتاً "فریضۂ اقامت دین" کے اس بنیادی تصور ہی کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ فریضۂ اقامت دین پر یقین رکھنے والے جو لوگ اس تحریک سے علیحدہ ہوئے انہوں نے بھی کچھ وقت تو اس کوشش میں صرف کیا کہ پھر اس تصور کے تحت کوئی اجتماعی جدوجہد شروع کریں' لیکن جب پے در پے ناکامیاں ہوئیں تو بالآخر ان میں سے بعض نے یہ سمجھتے ہوئے کہ انگور کھٹے ہیں' یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ کام فرائض دین میں شامل ہی نہیں ہے' نتیجتاً اس امت کی ایک بڑی قیمتی متاع ضائع ہو گئی۔

اس صدی میں دین کا یہ تصور نہایت وضاحت کے ساتھ اور نکھر کر سامنے آیا کہ دین اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور یہ کہ دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ یہ تصور اس امت کی بہت قیمتی متاع ہے۔ بعض اسباب کی بنا پر کچھ عرصے سے یہ تصور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا' کچھ حضرات کی مساعی اور گراں قدر خدمات کے نتیجے میں دوبارہ اجاگر ہوا۔ لیکن اب میں پھر دیکھ رہا ہوں کہ وہ گم ہو رہا ہے' ابہام اور شکوک و شبہات کا شکار ہو رہا ہے' لہٰذا میں نے اپنا اولین فریضہ یہی سمجھا کہ اس کو پھر سے اجاگر کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے مَیں نے اپنا یہ فرض ادا کیا ہے اور اس توفیق پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اسی تصورِ فرائض دینی کے تحت اب ایک اجتماعیت وجود میں آ چکی ہے۔

یہی نہیں' بلکہ ۱۹۸۵ء میں میں نے علماءِ کرام کو دعوت دے کر چھ دن متواتر اس موضوع پر ان کے خیالات سننے کا اہتمام کیا۔ ہوا یوں کہ میں نے قرآنِ حکیم اور سنت رسول اللہ ﷺ کے مطالعے سے جو کچھ سمجھا اسے تحریری شکل میں پیشگی طور پر اہل علم کی خدمت میں ارسال کر دیا اور ان سے درخواست کی کہ فرائض دینی کا یہ خاکہ میرے سامنے ہے' اگر اس میں کوئی غلطی یا خامی ہے تو محاضراتِ قرآنی میں تشریف لا کر میرے رفقاء و احباب کے سامنے مجھے اس غلطی پر متنبہ فرمائیں۔ میری اس دعوت پر ہر طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والے پچیس علماء تشریف لائے جن میں

دیوبندی بھی تھے' بریلوی بھی اور اہلحدیث بھی اور جماعت اسلامی کے بعض اکابر بھی۔ اگرچہ بعض علماء نے طنزو استہزاء کا معاملہ بھی کیا تاہم تمام مکاتب فکر کے چوٹی کے علماء نے میرے فکر کی بحیثیت مجموعی تائید کی۔ اس کے علاوہ پچیس حضرات نے علمی تحریروں سے بھی نوازا۔ مجھے اس سے خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ کہیں کہیں لفظی اصلاح بھی بعض علماء نے تجویز کی جس کا میں نے خیر مقدم کیا۔ اور میں ہمیشہ اس کے لئے ذہنا تیار رہتا ہوں کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جائے تو واضح ہونے پر علی الاعلان اس کا اعتراف کروں اور اپنی اصلاح کر لوں۔ بہرکیف میں نے ۱۹۹۱ء کے سالانہ اجتماع میں "فرائض دینی کا جامع تصور" کے موضوع پر اپنے خیالات کو مرتب کر کے تین گھنٹے کے مفصل خطاب کی صورت میں ریکارڈ کرا دیا ہے۔ اور اس طرح گویا آج کی تاریخ تک فرائض دینی کے بارے میں میرا جو بھی حاصل مطالعہ ہے اسے نہایت جامعیت کے ساتھ میں اپنی اس تقریر کے ذریعے سے آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں۔

(۲) اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی اور اس کے نمایاں خدوخال

دوسرا اہم موضوع یا Theme جس کی تفصیلی وضاحت میں اپنے دروس و تقاریر کے ذریعے کرتا رہا ہوں' اس کا تعلق اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی سے ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام ایک مکمل دین ہے جو زندگی کے تمام گوشوں میں ہمیں رہنمائی دیتا ہے اور پورے نظامِ زندگی پر اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ چنانچہ اقامت دین کا مطلب ہے پوری انسانی زندگی پر دین کا غلبہ ـــــ انفرادی سطح پر بھی ـــــ اور ـــــ اجتماعی سطح پر بھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف گوشوں یعنی سماجی و معاشرتی' معاشی و اقتصادی اور سیاسی و دستوری میدان میں اسلام کا وہ نظامِ عدلِ اجتماعی ہے کیا؟ اس کے خدوخال کیا ہیں؟ اس کے مابہ الامتیاز پہلو کون کون سے ہیں؟ ان تمام مسائل میں بہت سا ابہام موجود ہے' کیونکہ عرصۂ دراز سے اسلام کا نظامِ

عدلِ اجتماعی اپنی اصل صورت میں دنیا میں کہیں قائم نہیں رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے حسین و جمیل چہرے پر داغ دھبے پڑ چکے ہیں۔ بیگانے تو کیا خود اپنے بھی اسے پہچان نہیں رہے' اس لئے کہ خلافت راشدہ کے بعد عرصۂ دراز تک اس پر ملوکیت کی چھاپ پڑی رہی۔ اس طرح اسلام کا اصل چہرہ تاریخ کے پردوں میں گم ہو کر رہ گیا۔ اس کے بعد سرمایہ داری اور جاگیرداری کی سیاہ رات اس پر چھا گئی۔ یوں پوری انسانی زندگی کو شامل دین رفتہ رفتہ محض ایک مذہب بن کر رہ گیا' اس نے ایک مکمل نظامِ زندگی کی شکل میں دورِ خلافت راشدہ کے بعد آج تک پھر کبھی دنیا کو اپنی شکل نہیں دکھائی۔ آج روئے زمین پر مسلمانوں کی متعدد حکومتیں اور بادشاہتیں ضرور موجود ہیں لیکن زمین پر کوئی ایک انچ جگہ بھی ایسی نہیں جہاں اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی اپنی اصل شکل میں موجود ہو' حالانکہ صحیح اور سچا نظام یہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بطورِ دین پسند کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا۔

تاہم دوسری جانب صورتِ حال یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا قافلہ اس دوران فکری طور پر کہیں ٹھہر نہیں گیا بلکہ مسلسل چودہ صدیوں سے اپنے انداز میں ارتقائی مراحل طے کرتا رہا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے ساتھ ساتھ عمرانی ارتقاء کا عمل بھی جاری رہا ہے۔ ذرا غور کریں' سیاسی میدان میں نوعِ انسانی نے ارتقائی سفر طے کرتے ہوئے بادشاہت کے نظام کا خاتمہ کیا جس کی جڑیں نہایت گہری تھیں' اس کے بعد جمہوریت کا تجربہ کیا۔ اسی طرح اقتصادی میدان میں سرمایہ داری کے خلاف شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا اور دوسری انتہا تک پہنچ کر کمیونزم کا تجربہ کیا' پھر ان دو انتہاؤں کے مابین synthesis یا تالیف کا معاملہ ہوا جس کے نتیجے میں سکنڈے نیوین سوشلزم کا نظریہ سامنے آیا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ جمہوریت' یہ کمیونزم اور یہ سکنڈے نیوین سوشلزم' آیا یہ کل کے کل کفر ہیں یا ان میں خیر کا کوئی پہلو بھی موجود ہے؟ "فرائض دینی کا جامع تصور" کی طرح یہ موضوع بھی میرے نزدیک

نہایت اہم ہے' اس لئے کہ دین کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے ضمن میں جتنی اہمیت اس بات کی ہے کہ ہمارے اندر جذبہ ہو' ایثار ہو' قربانی ہو' تاکہ ہم محنت کریں' جدوجہد کریں اور تن' من' دھن سب کچھ لگا دینے کے لئے تیار رہوں' اتنی ہی اہمیت اس بات کی ہے کہ دین کے بارے میں ہمارا تصور واضح ہو اور معلوم ہو کہ یہ نظام کیا ہے؟ سیاسی سطح پر اس کے خدوخال کیا ہیں؟ معاشی سطح پر اس کے خدوخال کیا ہیں؟ وغیرہ۔

میں نے اس سے قبل بارہا اعلان و اعتراف کیا ہے' آج پھر یہی بات دہراؤں گا کہ اس ضمن میں مجھے سب سے زیادہ راہنمائی فکر اقبال سے ملی ہے۔ دورِ حاضر کی ذہنی اور فکری سطح کے اعتبار سے علامہ اقبال سے زیادہ کسی نے قرآن حکیم کو نہیں سمجھا۔ اس اعتبار سے ان کا مقام بہت عظیم ہے۔ ان کے مشاہدے' مطالعے اور تجزیئے کا حاصل مندرجہ ذیل اشعار میں بڑی عمدگی سے سمویا گیا ہے:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو　　آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ ؐ او را بہاست　　یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ؐ است

کہ نوعِ انسانی نے عمرانی ارتقاء کا جو طویل سفر طے کیا ہے اس میں اگر کوئی روشنی' کوئی خیر' کوئی بھلائی تمہیں نظر آتی ہے تو یہ نورِ مصطفیٰ ﷺ سے مستعار ہے اور اگر کوئی کمی ہے تو اس کی تلافی کے لئے نوعِ انسانی چار و ناچار اسی نظامِ مصطفیٰ کی طرف کشاں کشاں کھنچی چلی جا رہی ہے۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے ٹھوکریں کھائے گی' افراط و تفریط کے دھکے کھائے گی لیکن بالآخر یہ قافلۂ انسانیت وہیں پہنچ کر رہے گا۔

ٹھنڈے دل سے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا جمہوریت یا سوشلزم کل کے کل کفر ہیں یا ان میں کسی پہلو سے اسلام کے ساتھ کوئی مطابقت بھی موجود ہے؟ اور اگر ہے تو کتنی ہے کہ جسے ہم اپنا سکتے ہوں! رسول اللہ ﷺ کی مشہور حدیث ہے: ((اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا))[1] یعنی

---

(1) سنن الترمذی' کتاب العلم' باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة

"حکمت کی بات مؤمن کی گمشدہ متاع ہے' جہاں سے بھی ملے وہ اس کا سب سے پہلے حقدار ہے"۔ ہم ان چیزوں کو پورے کا پورا رد کردیں گے تو اپنا ہی نقصان کریں گے' اس میں کسی اور کا نقصان نہیں ہے۔ البتہ جس جس پہلو سے اس میں کمی ہے اس کا واضح شعور ہونا چاہئے اور اس کا کھلے بندوں اظہار و اعتراف بھی ہونا چاہئے۔

گزشتہ تین سال سے ہمارے ہاں محاضرات قرآنی کا Main theme یہی موضوع یعنی "اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی" یا "اسلام کا نظامِ حیات" رہا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں اس عنوان کے تحت پہلے لاہور میں اور پھر کراچی میں ہم نے محاضرات منعقد کئے۔ اگلے سال پھر اسی موضوع کو ہم نے محاضراتِ قرآنی کا عنوان بنایا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی" یا "اسلام کا نظامِ حیات" وہ دوسرا اہم موضوع (Main theme) ہے جو اب تک میری ساری ذہنی و فکری جدوجہد کا محور رہا ہے اور بحمد اللہ اب بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو قوتِ بیان عطا فرمائی ہے اس کے استعمال کا دوسرا بڑا اور بنیادی نکتہ یہی عنوان رہا ہے۔

(۳) منہج انقلابِ اسلامی

تیسرا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ یہ انقلاب برپا کیسے ہو؟ اس کا طریق کار (Method) کیا ہے؟ اس کے مراحل کون کون سے ہیں؟

منہج انقلابِ اسلامی کو جاننے کا ہمارے پاس بنیادی طور پر ایک ہی ذریعہ (source) ہے' اور وہ ہے اسوۂ محمدیؐ ۔ چنانچہ اس پہلو سے سیرت النبی ﷺ کا مطالعہ انتہائی ضروری ہے کہ معلوم کیا جائے کہ انقلابِ نبویؐ کا طریق کار کیا تھا؟ آپ ﷺ نے کن خطوط پر چل کر انقلاب برپا کیا؟ آپ کی جدوجہد کے مراحل کیا تھے؟ سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں ہمارے لئے یہ معین کرنا آسان ہوگا کہ ہر ہر مرحلے کے اہم نکات کیا ہیں اور ان کی خصوصیات کیا ہیں؟ پھر یہ کہ ایک مرحلے سے

دوسرے مرحلے تک بڑھنے میں کیا چیز شرط کا درجہ رکھتی ہے' کہ وہ شرط اگر پوری ہو تب آگے بڑھا جا سکتا ہے' اور اگر وہ شرط پوری نہ ہو تو ظاہر ہے کہ اگلا قدم اٹھانا بے کار ہو گا اور محنت و صلاحیت ضائع جائے گی۔ اس ضمن میں' میں خاص طور پر جنرل ضیاء الحق مرحوم کا ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے سیرت کانفرنسوں کا جو سلسلہ شروع کیا اور ان میں چونکہ تقاریر کے لئے بالعموم مجھے مدعو کیا جاتا تھا' تو یہ موقع میرے لئے سیرت النبی ﷺ کے از سرنو بالاستیعاب مطالعے کے لئے ایک بڑا محرک بنا اور بہت سے اعتبارات سے نہایت مفید ثابت ہوا۔ جب مجھے پے در پے عوام و خواص کے اجتماعات میں سیرت کے موضوع پر تقاریر کرنا پڑیں تو مجھے غور و فکر کے لئے ایک تحریک ملی اور مطالعۂ سیرت کا ایک تازہ جذبہ بیدار ہوا' اس طرح سیرت نبویؐ کے مطالعے سے مجھ پر واضح ہوا کہ صحیح معنوں میں "منہج انقلابِ اسلامی" کیا ہے۔ اسی موضوع پر پھر میں نے گیارہ تقریریں مسجد دارالسلام میں کیں اور موضوع کے تمام گوشوں کو بالکل واضح کر دیا۔ والحمدللّٰہ علٰی نعمتہ۔ میری یہ تقریریں کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ اب میرا ارادہ ہے کہ ان تقاریر کو باقاعدہ ایک تصنیف کی شکل میں پیش کروں' اللہ کرے یہ مرحلہ جلد طے ہو جائے۔ وماذٰلک علی اللّٰہ بعزیز!

بہرحال "منہج انقلابِ اسلامی" کے موضوع پر میرا جو بھی حاصل مطالعہ ہے اسے بھی اس سال (یعنی اپریل ۱۹۹۱ء میں) میں نے تنظیم اسلامی کے سالانہ اجلاس میں گیارہ تقاریر کی بجائے تین گھنٹے کی ایک تقریر میں سمو دیا ہے تاکہ عام لوگوں کو بات سمجھنے میں آسانی رہے۔

(۴) حقیقت ایمان

اس سلسلے کا چوتھا بنیادی نکتہ جو میرے غور و فکر کا مرکز و محور اور دروس و تقاریر کا موضوع رہا' وہ "حقیقت ایمان" ہے۔ اور انگریزی محاورہ

"Last but not the least" کے مطابق اگرچہ ترتیب میں یہ آخری ہے لیکن کسی بھی اعتبار سے کمتر نہیں ہے' بس بیان میں چوتھے نمبر پر آگیا ہے۔ اس کی اہمیت تو مجھ پر اوّل روز سے واضح ہے۔ جب میں نے اپنے طور پر دعوتی و تحریکی جدوجہد کا آغاز کیا تو "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ : کرنے کا اصل کام" کے عنوان سے ایک مضمون قلم بند کیا' جو جون ۱۹۶۷ء کے میثاق میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں "قرآن اکیڈمی" کا تصور موجود تھا۔ اس وقت تعلیم و تعلّم قرآن کو تحریک کی شکل میں برپا کرنے کا خاکہ ذہن میں آیا تھا۔ ۱۹۶۷ء سے آج ۱۹۹۱ء تک چوبیس برس بیت گئے ہیں' اور اللہ کا شکر ہے کہ اس پر عمل جاری ہے۔ بہرحال اس کتابچے کا مرکزی مضمون یہی ہے کہ اگرچہ اس صدی کا یہ خاص معاملہ ہے کہ اس میں عالمی سطح پر احیائے اسلام کے لئے جدوجہد ہو رہی ہے' گزشتہ پچاس ساٹھ برس سے جماعت اسلامی' الاخوان المسلمون' مسجومی پارٹی' تبلیغی جماعت' عباد الرحمٰن گروپ اور سعید نورسی کی تحریک' سب ہی اپنے اپنے انداز میں اور اپنی فکر کے مطابق پوری محنت کے ساتھ کوشش کر رہے ہیں' لیکن یہ سوال ذہنوں میں آتا ہے کہ یہ سب تحریکیں دُنیوی نتائج کے اعتبار سے ناکام کیوں نظر آتی ہیں؟ تاحال کہیں پر بھی اسلامی انقلاب بالفعل برپا نہیں ہو سکا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ میری رائے میں ان تمام تحریکوں کے خلوص اور محنت کے باوجود ناکامی کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ تحریکیں ایمان کو Taken for granted لے رہی ہیں' یعنی جب ہم مسلمان ہیں تو ایمان تو لازماً موجود ہے۔ جو زور ایمان کے حصول پر ہونا چاہئے تھا اس کی ان تحریکوں نے بالعموم ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ حالانکہ یہی وہ چیز ہے جہاں پانی مر رہا ہے۔ جسے ہم ایمان سمجھ رہے ہیں وہ محض ایک موروثی عقیدہ ہے جس کا ہماری عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں' لیکن حقیقی ایمان یعنی یقین قلبی اور Personal Conviction کے درجے تک پہنچنے والا ایمان سرے سے مفقود ہے۔ ہم اپنی زندگیوں کو دیکھیں' اپنے معمولات پر تنقیدی نگاہ ڈالیں' اپنی اقدار کا تجزیہ کریں تو معلوم ہو گا کہ خالص مادہ

پرستانہ نقطۂ نظر ہمارے ذہن و قلب پر مسلط ہے۔ آخرت پر اگر فی الواقع ایمان موجود ہو تو انسان کی دنیاوی زندگی کچھ اور ہی قسم کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان اگر ذہن و قلب میں راسخ ہو تو کچھ اور ہی طرح کا کردار وجود میں آتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ سے حقیقی محبت اگر دل میں موجود ہو تو اس کا اظہار کسی اور طرح سے ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کہاں ہے؟ معلوم ہوا کہ اصل کمی یہاں ہے' پانی یہاں مر رہا ہے!!

ان تحریکوں کی ناکامی میں کچھ حصہ عجلت پسندی اور جلد بازی کا بھی ہے کہ ایک متعد بہ افراد اور معاشرے کے ذہین عناصر کے ذہنوں کو بدلے بغیر قبل از وقت سیاسی میدان میں چھلانگ لگا دی گئی۔ مختلف تحریکوں نے اس نوع کی غلطیاں بھی کی ہیں' لیکن ان تمام غلطیوں میں سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ ایمان پر جو زور (emphasis) ہونا چاہئے تھا' وہ نہیں ہے۔ ۱۹۶۷ء سے میری یہی رائے ہے اور میں ہمیشہ اپنی رائے کسی لومۃ لائم کی پروا کئے بغیر بیان کر دیا کرتا ہوں۔ میری ذہنی و فکری تگ و دو اور دعوتی و تحریکی جدوجہد کے اعتبار سے چوتھا موضوع یا theme یہی "حقیقت ایمان" ہے' مگر اہمیت کے اعتبار سے یہ پہلے نمبر پر ہے۔ بسط و اختصار کے ساتھ میں نے حقیقت ایمان پر متعدد بار گفتگو کی ہے' لیکن ۱۹۸۷ء میں مسجد دارالسلام میں گیارہ خطباتِ جمعہ میں اس کا احاطہ کیا اور اس ضمن میں جو اعتراضات' تجاویز اور اصلاحات سامنے آئیں ان پر غور و فکر کیا اور دلیل واضح ہونے پر بعض اصلاحات کو قبول بھی کیا۔ چنانچہ اس وقت میری یہ کوشش ہے کہ اپنی سوچ کو پانچ خطبات میں سمو کر پیش کر دوں۔

باب دوم

ایمان کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم

شرعی اصطلاحات کی بنیاد

قرآن حکیم عربی زبان میں ہے اور نبی اکرم ﷺ کی زبان بھی عربی تھی۔ چنانچہ قرآن حکیم کی بنیادی اصطلاحات کو سمجھنے اور قرآن و حدیث سے براہ راست استفادے یا بالفاظِ دیگر دین سیکھنے کے لئے عربی زبان جاننا اشد ضروری ہے۔

عربی زبان میں ہر لفظ کا ایک مادہ (root) اور بنیادی مفہوم ہوتا ہے۔ لیکن جب کوئی لفظ اصطلاح کی صورت اختیار کرلیتا ہے تو پھر اصل حجت لغت نہیں بلکہ دینی اصطلاح ہوتی ہے اور اس کا مفہوم قرآن و حدیث سے متعین ہو گا۔ مثلاً لفظ "صلوٰۃ" کا لغوی مفہوم ہے آگ تاپنا اور اِقدام الی الشَّیء۔ محض اس مفہوم کو سامنے رکھ کر صلوٰۃ کے معنی نکالنا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا شرعی مفہوم وہی ہو گا جو کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول ﷺ سے ثابت ہو گا۔ اسی طرح لفظ "صوم" کے لغوی معنی ہیں "رُک جانا"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کس چیز سے رک جانا؟ کب رک جانا؟ کس صورت میں رک جانا؟ اور کس وقت سے لے کر کس وقت تک رکے رہنا؟ یہ تمام مفاہیم و معانی قرآن حکیم اور سُنّتِ رسول اللہ ﷺ کی راہنمائی میں معین ہوں گے۔ معلوم یہ ہوا کہ دینی اصطلاحات میں اصل بنیاد لغوی معنی نہیں بلکہ شریعت کے مقرر کردہ معانی و مفاہیم ہیں۔

لغوی معنی اور شرعی اصطلاح میں باہمی ربط

قرآنِ حکیم اور سُنّتِ رسول ﷺ میں بیان ہونے والی اصطلاحات کا اپنے لغوی معنی کے ساتھ کسی نہ کسی درجے میں کوئی ربط اور کوئی نہ کوئی معنوی تعلق بھی برقرار

رہتا ہے۔ اس ربط و تعلق پر غور کرنے سے ان اصطلاحات کی روح اور ان کے حقیقی مفہوم پر ایک باطنی بصیرت ضرور حاصل ہوتی ہے کہ اس کا اصل مفہوم کیا ہے۔

لفظ صلوٰۃ کا ایک مفہوم ہے اِقدام اِلی الشَّیء۔ تو یہ معنیٰ ﴿ اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴾ (میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف کرلیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور میں بالکل یکسو ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔)[1] والی دعا میں موجود ہے جو کہ ابتداءِ نماز میں پڑھنی مسنون وماثور ہے۔ اسی طرح آگ تاپنے کا مفہوم ذکر الٰہی کے ذریعے اپنی روح کو گرم کرنے میں موجود ہے۔ گویا کہ یہ تمام معانی لفظ کی روح میں شامل ہیں۔ زکوٰۃ کی روح بھی یہی ہے کہ اپنے نفس کا تزکیہ کرنا' مال کی محبت سے دل کو پاک صاف کرنا۔ چنانچہ ایسا بھی نہیں ہے کہ کلمے کی لغوی اساس کا شرعی اصطلاح سے کوئی تعلق ہی نہ ہو' بلکہ ان اصطلاحات کی جو باطنی روح ہے وہ لغوی اصل سے اجاگر ہوتی ہے اور مزید واضح ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ بات طے ہے کہ لغوی معنی کو اصطلاحی معنی پر حاکم نہیں کیا جا سکتا۔ فیصلہ کن بات وہی ہوگی جو کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ ﷺ سے اصطلاح کا مفہوم معین کرنے کے لئے ثابت ہو۔

لفظ ایمان کی لغوی تحقیق

عربی زبان کے نناوے فیصد سے زائد الفاظ ایسے ہیں جن کا ایک سہ حرفی مادہ ہوتا ہے اور اسی مادے سے الفاظ بنتے چلے جاتے ہیں۔ سادہ ترین مثال ہے "علم"۔ اس سے بنا "عالم" (یعنی علم رکھنے والا' جاننے والا) "معلوم" (وہ چیز جو کسی کے علم میں ہے) "علامہ" (بہت زیادہ علم رکھنے والا) "علامت" (پہچان) "استعلام" (معلومات حاصل کرنا) "متعلم" (علم سیکھنے والا) "معلم" (علم دینے والا)۔ اس طرح

---

(۱) صحیح مسلم:۷۷۱' کتاب صلاۃ المسافرین' باب الدعاء فی صلاۃ اللیل وقیامہ۔ وسنن الترمذی:۳۴۱۷' ومابعدہ۔ وسنن ابی داؤد:۷۶۰

"ع ل م" سے الفاظ بنتے چلے جائیں گے اور اوزان کے مطابق مختلف سانچوں میں ڈھلتے جائیں گے، لیکن تمام الفاظ کا اپنے اصل مادے یعنی "علم" سے تعلق برقرار رہے گا۔ گویا ﴿ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِی السَّمَآءِ ﴾۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر غور کریں تو ایمان کا مادہ "امن" (ا م ن) ہے۔ چنانچہ امن اور ایمان میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَالَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا ؕ فَاَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ ﴾ (الانعام : ۸۱'۸۲)

"اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لئے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی۔ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ امن و اطمینان کا مستحق ہے' بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن انہی کے لئے ہے اور راہِ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔"

ان آیات کا پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنی قوم کے ساتھ جھگڑا ہو رہا تھا اور لوگ انہیں ڈرا رہے تھے کہ تم نے تمام معبودوں کا انکار کر دیا ہے' تمہاری تو شامت آ کر رہے گی' تو انہوں نے جواب میں فرمایا : ﴿ اَیُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ کہ اس وقت میدان میں دو فریق ہیں' ایک موحدین کا اور دوسرا مشرکین کا' ان دونوں میں سے کون زیادہ امن کا مستحق ہے؟ تم خود غور کرو' سوچو' ایک ہزار معبودوں کو پوجنے والے یا ایک خدائے بزرگ و برتر کو ماننے والے۔ ساتھ ہی اس کا جواب بھی دے دیا گیا کہ ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ○ ﴾ گویا کہ

امن کی منزل ایمان کی شاہراہ پر چل کر ملتی ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ میں امن اور ایمان کا تعلق بہت واضح ہو کر سامنے آگیا ہے۔

قرآن حکیم میں لفظ "اَلْاَمْنُ" تین ہی بار استعمال ہوا ہے۔ دو مرتبہ تو ان ہی آیات میں آگیا ہے اور ایک مرتبہ سورۃ النساء آیت ۸۳ میں آیا ہے' جہاں لفظ "خوف" کے مقابلے میں "امن" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا :

﴿ وَاِذَا جَآءَ هُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ﴾

(النساء : ۸۳)

"یہ لوگ جہاں کوئی امن کی یا خوف کی خبر سن پاتے ہیں اسے لے کر پھیلا دیتے ہیں۔"

منافقین کی روش پر تبصرہ کیا گیا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ کہیں سے خوف یا امن کی خبران تک پہنچی تو ذمہ دار لوگوں تک پہنچانے کی بجائے اسے فوراً عام لوگوں میں نشر کر دیا۔ ظاہر ہے کہ خوفناک خبر سے سنسنی تو پیدا ہو گی۔ ایک ہی آیت میں امن اور خوف کے بالمقابل استعمال سے لفظ "امن" کا مفہوم واضح ہو گیا کہ یہ خوف کی ضد ہے' کیونکہ قانون ہے :"تُعْرَفُ الْاَشْيَاءُ بِاَضْدَادِهَا" (اشیاء کو ان کی اضداد کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔)

ایمان کی گہرائی اور گیرائی جب اس درجے کو پہنچ جائے کہ انسان اس کیفیت کو پالے ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) [۲] "کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ اسے سامنے دیکھ رہے ہو' اور اگر تم اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تو یہ یقین ضرور رہے کہ وہ ذات تم کو دیکھ رہی ہے" تو یہ مقامِ احسان ہے' جہاں پہنچ کر یقین کی کیفیت اتنی گہری ہو جاتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ "ولایت باہمی" کے رشتے میں جڑ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس انعام کا

---

(۲) صحیح البخاری:۵۰' کتاب الایمان' باب ۳۶ سوال جبریل النبی ﷺ عن الایمان۔ و صحیح مسلم:۹' کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام۔

مستحق ہو جاتا ہے جس کا ذکر سورۃ یونس کی آیات ۶۲ اور ۶۳ میں ہے :

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○ ﴾

"سنو' جو اللہ کے دوست ہیں' جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا راستہ اختیار کیا ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

نیک اعمال کے حوالے سے یہ مضمون قرآن حکیم میں تیرہ دفعہ بیان ہوا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ خوف و حزن سے نجات پانا ہی "امن" ہے اور یہی امن کا حقیقی اور اصلی مفہوم ہے۔

لفظ امن کی شاخیں اور ان کا مفہوم

"اَمِنَ 'يَاْمَنُ 'اَمْنًا وَ اَمَنَةً" کے معنی ہیں "امن میں ہونا"۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن حکیم میں بار بار آیا ہے۔ (۳) اَمِنَ سے اسم الفاعل بنتا ہے آمِنٌ (۴)' جو کہ خود

---

(۳) یہ لفظ صرف سورت الملک میں دو مرتبہ استعمال ہوا ہے' فرمایا : ﴿ ءَ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ○ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ﴾ (الملک : ۱۶'۱۷) "کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تمہیں زمین میں دھنسا دے اور یکایک یہ زمین جھکولے کھانے لگے' کیا تم اس سے بے خوف ہو کہ وہ جو آسمان میں ہے تم پر پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیج دے۔" اسی طرح کی پتھراؤ کرنے والی ہوا قومِ عاد پر آ چکی ہے ——— سورۃ الاعراف میں یہ لفظ بیان ہوا ہے : ﴿ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ ﴾ (آیت : ۹۹) "کیا اللہ کی چالوں سے وہ اپنے آپ کو مامون سمجھتے ہیں؟ (محفوظ سمجھتے ہیں؟ امن میں سمجھتے ہیں؟) تو جان لو کہ اللہ کی چال سے امن میں ہونے والا وہی ہو سکتا ہے جو کہ خسارہ پانے والا ہو۔" مذکورہ بالا آیات کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اَمِنَ يَاْمَنُ کا معنی ہے امن میں ہونا۔

(۴) قرآن حکیم میں یہ لفظ "اٰمِنًا" کی شکل میں چھ مرتبہ آیا ہے "اٰمِنَةً" کی شکل میں ایک مرتبہ "اٰمِنُوْن" دو مرتبہ "اٰمِنِيْن" آٹھ مرتبہ استعمال ہوا ہیں۔ سورۃ الفتح میں فرمایا گیا : اے مسلمانو! گھبراؤ نہیں' اس وقت صلح حدیبیہ ہو جانے کے باعث تمہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

امن میں ہو۔ اسی سے لفظ "مَاْمُوْنٌ" بنتا ہے جو کہ اسم المفعول ہے' یعنی جس سے کوئی اندیشہ نہ ہو' جس سے امن لے لیا گیا ہو' جسے زیر کر لیا گیا ہو' جس سے کوئی اندیشہ نہ رہے کہ وہ آپ کو کوئی گزند پہنچا سکتا ہو۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن حکیم میں صرف ایک مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا :

﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ ﴾ (المعارج: ۲۸)

"یقیناً ان کے رب کا عذاب ایسی شے نہیں ہے جس سے بے خوف اور نڈر ہوا جا سکے۔"

لفظ امن سے اسم ظرف آتا ہے "مَاْمَنٌ"(۵) یعنی امن کی جگہ۔

اسی طرح امن سے صفت مُشبہ ہو گی : "اَمِيْنٌ"۔ واضح رہے کہ صفت مُشبہ اسم الفاعل اور اسم المفعول دونوں کا معنی دیتی ہے۔ چنانچہ جو خود امن میں ہو اسے بھی "امین" کہیں گے اور جس شخص سے دوسرے لوگ امن میں ہوں وہ بھی "امین" ہے۔ لفظ "امین" دونوں معنی کے اعتبار سے قرآن مجید میں چودہ مرتبہ

(گزشتہ سے پیوستہ) عمرے کے بغیر ہی یہاں سے لوٹنا پڑ رہا ہے لیکن وہ وقت ضرور آئے گا جب ﴿ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ﴾ (الفتح : ۲۷) "ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے' اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے"۔ "اٰمِنِيْنَ" یعنی کوئی خوف' کھٹکا' بے چینی اور اندیشہ نہ ہو گا۔ (ماخوذ)

(۵) سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا بس اب چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے : ﴿ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ (التوبہ : ۵) "جب یہ چار ماہ ختم ہو جائیں تو تم جہاں کہیں مشرکوں کو پاؤ قتل کر دو۔" آگے چل کر استثنائی صورت بیان کرتے ہوئے فرمایا : ﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ﴾ (التوبہ : ۶) "اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے امن کا طالب ہو تو آپ اسے پناہ دے دیجئے تاکہ وہ اللہ کا کلام سن لے' پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دیں۔" معلوم ہوا کہ "مَاْمَنَ" کے معنی ہیں امن کی جگہ۔ (ماخوذ)

استعمال ہوا ہے۔

فعل کے معنی پر صلہ کے اثرات

ہر زبان میں فعل (verb) کے ساتھ صلہ (preposition) کی تبدیلی کے ساتھ معنی بدل جاتے ہیں۔ جیسے انگریزی زبان میں "to give" کا مفہوم کچھ اور ہے اور "to give in" کا مفہوم کچھ اور ہی بن جاتا ہے۔ یہاں یہ لفظ محاورے کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ نیز "to give up" کے معنی کچھ اور ہی بن گئے۔ صرف صلہ (preposition) کے بدلنے سے معانی میں زمین و آسمان کا فرق واقع ہو رہا ہے۔ ایک درجے میں یہ بات عربی زبان کے ساتھ بھی ہے۔ صلہ بدلے گا تو مفہوم بھی بدلے گا۔ لیکن عربی بڑی حسابی یعنی mathematical زبان ہے۔ اس میں صلہ کی تبدیلی کے ساتھ بھی جڑ یعنی مادے سے تعلق ختم نہیں ہوتا۔ چنانچہ "اَمِنَ" کے بعد اگر "بِ" یا "علٰی" کا صلہ آجائے تو معنی ہوں گے : کسی چیز پر کسی دوسرے کو امین بنانا۔ آپ نے کسی کے پاس امانت رکھوائی تو کہیں گے "اَمِنَ بِهٖ" اور "اَمِنَهٗ بِشَیءٍ" یعنی "اس نے امین بنایا اس کو ایک چیز کے بارے میں"۔ اب غور کریں کہ صلہ آنے کے بعد بھی معنی کا اپنی اصل سے تعلق برقرار رہا' کیونکہ امین اسی کو بنایا جاتا ہے جس کے بارے میں خیانت کا اندیشہ نہ ہو۔ چنانچہ "اَمِنَ فُلَانًا بِفُلَانٍ" یا "عَلٰی فُلَانٍ" کا مفہوم ہوگا : "کسی کو امین بنانا کسی پر' یا کسی کے بارے میں اعتماد کرنا۔" مثلاً اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ... ﴾ (آل عمران : ۷۵)

"اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ ڈھیروں سونے پر بھی اگر انہیں امین بنا دو گے تو وہ تمہیں واپس کر دیں گے' لیکن ان میں ایسے بھی ہیں کہ ایک دینار بھی اگر امانت رکھوا دو گے تو واپس نہیں کریں گے..."

تو معلوم ہوا کہ "اَمِنَ فُلاَنًا بِفُلاَنٍ" کا مفہوم ہے کسی کو کسی چیز پر امین بنانا۔ اسی معنی میں "علٰی" کا صلہ بھی آتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اپنے بیٹوں سے گفتگو کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے' فرمایا : ﴿ قَالَ ھَلْ اٰمَنُکُمْ عَلَیْہِ اِلَّا کَمَا اَمِنْتُکُمْ عَلٰی اَخِیْہِ مِنْ قَبْلُ ﴾ (یوسف : ٦٤) یعنی "کیا میں تمہیں امین سمجھوں اس (بن یامین) کے بارے میں بھی' اسی طرح جس طرح میں نے تمہیں امین بنایا تھا اس کے بھائی (یوسف) کے بارے میں؟"

لفظ "اَمِنَ" سے جب باب افتعال بنتا ہے تو اس کا معنی بھی امین بنانا ہی ہے۔ یعنی "اِئْتَمَنَ یَأْتَمِنُ" بمعنی امین بنانا اور بھروسہ کرنا۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ صرف ایک دفعہ استعمال ہوا ہے۔ فرمایا : ﴿ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُکُمْ بَعْضًا فَلْیُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَہٗ ﴾ (البقرۃ : ٢٨٣) "اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے تو پھر جس کو امین بنایا گیا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ امانت واپس کر دے۔"

لفظ ایمان کی لغوی اور شرعی تعریف

لفظ "اَمِنَ" کو بابِ افعال میں لے جائیں تو مصدر رہے گا : "ایمان" یعنی کسی کو امن دینا۔ تو لفظ ایمان کا ترجمہ ہوا "امن دینا"۔ اسی سے اسم فاعل بنتا ہے : "مُؤْمِنٌ" یعنی امن دینے والا۔ اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا نام ہے "اَلْمُؤْمِنُ"۔ سورۃ الحشر میں فرمایا گیا ہے : ﴿ اَلْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ ﴾ (امن دینے والا' نگہبان' سب پر غالب' اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا اور بڑا ہو کر رہنے والا)۔ تو معلوم ہوا کہ اَمِنَ۔ یَأْمَنُ۔ اَمْنًا کا مفہوم ہے : خود امن میں ہونا' اور اٰمَنَ۔ یُؤْمِنُ۔ اِیْمَانًا کے معنی ہیں : دوسرے کو امن فراہم کرنا۔

لفظ ایمان کے بعد جب "بِ" یا "لِ" کا صلہ آئے گا تو معنی ہو گا کسی کی تصدیق کرنا۔ مثلاً کسی نے آ کر کوئی خبر دی یا دعویٰ کیا تو جواب کی دو ہی شکلیں ہوں

گی : تصدیق یا تردید۔ تصدیق کردی تو امن رہا اور اگر تردید کردی تو جھگڑا شروع' جھگڑا تھوڑا ہو یا زیادہ' زبانی کلامی ہو یا ہاتھاپائی ہو یا قتال اور خون ریزی' بہر حال جھگڑا شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ "آمَنَ بِهٖ" اور "آمَنَ لَهٗ" کے معنی ہیں کسی کی تصدیق کرنا۔ تصدیق کرنے میں امن کے ساتھ تعلق برقرار رہا اور تصدیق کرنے کا معنی دعوٰی کرنے والے کو امن دینا ہے۔ قرآن حکیم میں "ل" کے صلے کے ساتھ "آمَنَ لَهٗ" کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں سرسری طور پر کسی کی بات کو مان لینا۔ اگرچہ یہاں ایک استثناء موجود ہے : ﴿ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ﴾ (العنکبوت : ۲۶) یعنی حضرت لوط علیہ السلام بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ یہاں ایمان لانا سرسری معنی میں نہیں ہے۔

عام طور پر لفظ "ایمان" جب "لِ" کے صلے کے ساتھ آئے تو اس میں زیادہ گہرائی اور وثوق والی بات نہیں ہوا کرتی' لیکن جب "بِ" کے صلے کے ساتھ آئے تو اس کے معنی میں بڑے وثوق اور بھرپور اعتماد کے ساتھ کسی بات کو مان لینا اور کسی کے دعوے کی تصدیق کرنا شامل ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے لفظ ایمان کو جب اصطلاحی معنوں میں بیان کیا ہے تو "بِ" کے صلے کے ساتھ ذکر کیا ہے' فرمایا : ﴿ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ﴾..... ﴿ اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ ﴾..... ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ﴾ ..... ﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ (یہ سب آیات سورۃ البقرۃ کی ہیں)۔ ایمانِ مجمل کے الفاظ ہیں : آمَنْتُ بِاللّٰهِ کَمَا هُوَ بِاَسْمَاءِهٖ وَصِفَاتِهٖ..... اور ایمان مفصل کے الفاظ ہیں : آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ..... گویا جب لفظ ایمان "بِ" کے صلے کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہیں تصدیق کرنا۔

اصطلاحی اور شرعی تعریف

جب ایمان نام ہے تصدیق کا' تو تصدیق ہو گی نبی کی' اس کے دعوائے نبوت

کی' اور اس دعوت کی بنیاد پر نبی جو کچھ پیش کرے اس کی۔ یعنی "تصدیقُ بما جاء به النبیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم"۔ علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں : "الایمان لغةً التصدیق وشرعًا تصدیقُ الرسولِ فیما جاء بہٖ عن ربہٖ"[٦] یعنی لغوی اعتبار سے ایمان نام ہے صرف تصدیق کا اور شرعاً : رسول جو کچھ اپنے رب کی طرف سے لائے اس کی تصدیق کا"۔

نبی اور رسول کی لائی ہوئی تعلیمات مختلف امور پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ غیبی امور ہوتے ہیں' مثلاً اللہ پر ایمان' فرشتوں پر ایمان' آخرت پر ایمان۔ اسی طرح ان تعلیمات میں سے بعض کی نوعیت احکام کی ہوتی ہے۔ یہ اوامر ہیں' یہ نواہی ہیں' یہ فرائض ہیں' یہ حلال ہیں اور یہ حرام ہیں۔ نبی و رسول سابقہ امتوں کے حالات اور قصص بھی بیان کرتے ہیں' ان کی تصدیق بھی شامل ایمان ہو گی۔ لیکن معروف معنی میں لفظ ایمان کا اطلاق صرف ان غیبی امور کی تصدیق پر ہوتا ہے جن کو جاننے کا ہمارے پاس خود اپنا کوئی ذاتی ذریعہ نہ ہو' مثلاً موت کے بعد کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ فرشتوں کو ہم نہیں دیکھ سکتے اور اسی طرح کے دوسرے غیبی امور ہماری دسترس سے باہر ہیں' اسی لئے سورۃ البقرۃ کے بالکل شروع میں ایمان کے لئے جو لفظ آیا ہے وہ ہے ﴿ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ ﴾ یعنی "وہ (متقی لوگ) غیبی امور پر ایمان لاتے ہیں۔" تو معلوم ہوا کہ ایمان کا اصلاً اور اصطلاحاً مفہوم "غیبی امور کو تسلیم کرنا" ہے۔

واضح رہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے پہلے نبی تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی۔ ان کے درمیان ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور تین سو پندرہ رسول تشریف لائے۔ ان رسولوں میں سے پانچ رسولوں کو "اولوا العزم" کا لقب ملا ہے۔ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ایک حصہ

---

(٦) فتح الباری' شرح صحیح البخاری' کتاب الایمان' ج ۱ ص ۴۰' طبع دار الریان

احکامِ شریعت کہلاتا ہے جو ہر علاقے اور زمانے کے اعتبار سے بدلتا رہا ہے۔ مثلاً نماز کی صورتیں بدلتی رہی ہیں، روزے کے احکام بدلتے رہے ہیں۔ البتہ دین کا دوسرا حصہ "ایمانیات" کہلاتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، بال برابر فرق نہیں آیا۔ حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام سب کی ایمانیات کی تعلیم ایک ہی رہی ہے۔ یہ چونکہ انبیاء کی تعلیم کا وہ حصہ ہے جو امورِ غیبی سے متعلق ہے، لہٰذا اس میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

بابِ سوم

ایمان کا موضوع

ہماری گفتگو کا پہلا حصہ جو ایمان کی لغوی اور اصطلاحی بحث پر مشتمل تھا' قدرے ثقیل تھا' لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان امور کے ساتھ بھی ہمارا ذہنی ربط ضروری ہے تاکہ ہم لفظ ایمان کو پوری گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں اور ہمیں معلوم ہو کہ یہ لفظ کہاں سے چل کر کہاں پہنچا ہے' اس کی جڑ اور اس کا اساسی مفہوم کیا ہے اور اب اصطلاحاً یہ کن معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

ایمان کا موضوع کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے ذرا پیچھے بیان ہونے والی بحث پر نظر دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ ایمان کا تعلق غیب کی خبروں سے ہے۔ اور ایسی خبریں کوئی نبی یا رسول ہی دے سکتا ہے۔ ایسے غیبی امور سے متعلق مباحث کو فلسفیانہ اصطلاح میں "مابعد الطبیعیات" کا علم کہتے ہیں جو فلسفہ کی ایک اہم شاخ ہے۔ "طبیعیات" اور "مابعد الطبیعیات" ہمارے علم کے دو دائرے (domains) ہیں۔ ایک کا تعلق مادی دنیا یعنی Physical world سے ہے اور یہ حواسِ خمسہ کا دائرہ ہے۔ ان کے ذریعے سے ہمیں مادی کائنات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ جدید تحقیقات اور ایجادات کے ذریعے ان حواسِ خمسہ کا دائرہ ہم نے وسیع کر لیا ہے۔ مثلاً خوردبین ایجاد کر لی تو ہماری بینائی باریک سے باریک چیزوں کا مشاہدہ کرنے لگی اور دوربین ایجاد کر لی تو ہماری بینائی کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ بہرکیف عالمِ مادی میں حصولِ علم کا اصل ذریعہ ہمارے حواسِ خمسہ ہیں۔ اس عالمِ محسوسات کے مختلف شعبوں میں ہم نے اپنی قوتِ ادراک کو بڑھایا اور نت نئی تحقیقات کے ذریعے اس میں ترقی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس دَور میں مادی یا طبیعی دنیا سے متعلق معلومات ایک دھماکے (explosion) کے سے انداز میں وسعت پذیر ہوئی ہیں۔ یہ

اس دور کا طرۂ امتیاز ہے۔

ہمارے علم کے دوسرے دائرے کا تعلق "مابعد الطبیعیات" (metaphysics) سے ہے گویا کہ اس کا تعلق عالمِ حواس یا عالمِ محسوسات سے نہیں بلکہ اس سے ماوراء کسی عالم سے ہے۔ اس دوسرے علم سے متعلق لامحالہ کچھ سوال ذہن میں اٹھتے ہیں۔ جو آدمی کسی بھی درجے میں عقل و شعور رکھتا ہے وہ ان کے بارے میں ضرور سوچتا ہے' البتہ ان سوالوں کے تشفی بخش جواب پانے کے لئے جو وسائل ہمیں دستیاب ہیں وہ انتہائی ناکافی ہیں' کیونکہ ہمارے مادی وسائل کی وہاں تک رسائی ہی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی مابعد الطبیعیاتی موضوعاتِ ایمان کا اصل موضوع ہیں۔

چند قابلِ توجہ حقائق

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ چند انتہائی اہم اور ہماری گفتگو کے اعتبار سے نہایت ضروری حقائق کو سمجھ لیا جائے۔

پہلی حقیقت : علم و عمل کے اعتبار سے انسان دو قسم کے ہوتے ہیں : (i) تقلیدی مزاج کے حامل اور (ii) تحقیقی مزاج رکھنے والے!

انسانوں کی اکثریت تقلیدی مزاج کی حامل ہوتی ہے کہ جس ماحول اور معاشرے میں انہوں نے آنکھ کھولی' اس معاشرے میں جن نظریات اور اعتقادات کا تسلط تھا انہوں نے بھی ان نظریات کو اختیار کر لیا' جو طرز زندگی لوگوں نے اختیار کیا ہوا تھا انہوں نے بھی اسی طرزِ زندگی کو اپنا لیا' جو values (اقدار) وہاں رائج تھیں انہوں نے بھی بے چون و چرا انہیں قبول کر لیا اور جن اہداف کے لئے سب کوشاں اور سرگرداں نظر آئے یہ بھی اسی دوڑ میں شامل ہو گئے اور انہی راہوں پر چل کر زندگی گزار دی۔ انسانوں کی عظیم اکثریت اسی طرح کے تقلیدی ذہن اور مزاج کے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

البتہ ہزاروں اور لاکھوں افراد میں ایک دو افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس تقلیدی جم غفیر کے برعکس تحقیقی مزاج رکھتے ہیں۔ ایسے تحقیقی مزاج اور ذہن کے حامل افراد کی تعداد ہمیشہ اقل قلیل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ کسی چیز کو صرف اس لئے ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ سب اس کو مان رہے ہیں اور کوئی کام صرف اس لئے کرنے کو تیار نہیں ہوتے کہ سب یہی کام کر رہے ہیں' بلکہ وہ حقیقت اور صداقت کو خود جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ حق کو دلیل کے ساتھ معلوم کرنا اسی کا نام ہے۔ حقیقت کو جاننے کے لئے یہ لوگ اپنی عقل و فہم کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ حق تک پہنچنے کے لئے شدید محنت اور جد و جہد کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ نادر الوجود ہوتے ہیں۔ گوتم بدھ اپنے زمانے میں ایک ہی تھا' لیکن آج اس کے نام لیوا کروڑوں میں ہیں۔ اس کے نظریات صحیح تھے یا غلط' یہ ہمارا موضوع نہیں۔ اسی طرح سقراط [1] بھی اپنے زمانے میں ایک ہی پیدا ہوا اور آج مغرب کے سارے فلسفے کا تانا بانا اور سلسلہ اسی سقراط اور اس کے شاگردوں سے جڑتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ ایسے نابغۂ روزگار حضرات کا ان کی زندگی میں کوئی ساتھ دے یا نہ دے' لیکن بعد میں لوگ انہی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ ابتداء میں چند ہی لوگ ایسے حضرات کی بات کو سمجھ پاتے ہیں' پھر آہستہ آہستہ عام لوگ بھی ان کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ بالآخر تقلیدی مزاج کے تحت نسلاً بعد نسلٍ ان حضرات کے پیش کئے ہوئے نظریات عام لوگوں کے لئے عقائد کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔

دوسری <u>حقیقت</u> : اسی طرح علم کی بھی دو قسمیں ہیں : (۱) علم الادیان (۲) علم

---

۱) سقراط اپنے نظریات پر کس قدر جازم تھا اور اپنی فکر کے پرچار کا کتنا مشتاق تھا' اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے سامنے دو راستے رکھے گئے کہ یا تو زبان بند کر لے اور جن حقائق کا اس پر انکشاف ہوا ہے ان کا اعلان نہ کرے' ورنہ اس کی سزا یہ ہے وہ زہر کا پیالہ پی کر موت کو گلے لگا لے۔ اس نے زبان بند کرنا پسند نہیں کیا بلکہ زہر کا پیالہ پی کر اپنے پیش کردہ حقائق پر اپنے پختہ یقین کا ثبوت فراہم کر دیا۔ (ماخوذ)

الابدان۔ اس دوسرے علم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ : ۳۱)

"(اس کے بعد) اللہ نے آدم (علیہ السلام) کو ساری چیزوں کے نام سکھا دیئے' پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا : اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ"۔

یہ علم الاشیاء کی طرف اشارہ ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں گویا بالقوۃ (Potentially) ودیعت کردیا گیا تھا۔ سمع' بصر اور فواد کی جو صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر رکھ دی تھیں انہی کی بدولت لوگوں کو مادی کائنات اور اس کے اصول و قواعد اور اس میں مضمر قوتوں کا علم حاصل ہوتا رہا اور مادی علوم (Physical Sciences) کا دائرہ آگے بڑھتا رہا اور نہ معلوم کہاں تک بڑھتا چلا جائے گا۔ لیکن یہ علم الاشیاء ہے جسے علم الابدان کا نام بھی دیا گیا ہے۔ علامہ ابن خلدون نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ان کی طرف یہ الفاظ منسوب ہیں : "العلم علمان' علم الابدان وعلم الادیان" یعنی علم تو دو ہی ہیں : ایک علم الابدان' یعنی Physical bodies کا علم' جو فزکس یا Physical Sciences کہلاتا ہے۔ یہ علم یا اس سے متعلق حقائق کی تحقیق ہماری آج کی گفتگو کا موضوع نہیں ہے' اس لئے اس کو ایک طرف رکھ دیں۔ اور دوسرا ہے علم الادیان' جو ان حقائق سے بحث کرتا ہے جو مادی علم کی رسائی سے باہر ہیں۔ حقیقت مطلقہ سے متعلق کچھ کلی اور اصولی سوالات اس کا اصل موضوع ہیں' چنانچہ یہ علم ان کے جوابات سے بحث کرتا ہے۔ اس کا دائرۂ بحث کلی حقائق ہیں' جزوی حقائق نہیں۔ اس علم میں اس جزوی حقیقت سے بحث نہیں ہو سکتی کہ پانی کی اصل کیا ہے؟ آیا وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنا ہے یا کچھ اور ہے؟

پوری کائنات وسیع ترین حقیقت ہے' اس میں جزوی اور کلی دونوں قسم کے حقائق موجود ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ اسے جزدی حقائق کے ساتھ ساتھ کلی حقائق کی بھی خبر ہو اور یہ انسان کی اشد ضرورت ہے' کیونکہ انسانی رویئے کا دارومدار انہی چیزوں سے متعلق نظریات اور عقائد کو ماننے اور نہ ماننے پر ہے۔ مثلاً انسان کو اپنی ذات کے متعلق خبر ہونی چاہئے کہ وہ کیا ہے اور کون ہے ؟ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ میں کون ہوں' زندگی کا طرزِ عمل کیسے معین ہو گا۔ زندگی کا رخ معین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مجھے معلوم ہو کہ میری زندگی کی حقیقت کیا ہے ؟ آیا موت پر زندگی کا اختتام ہے یا موت کے بعد بھی زندگی کی کوئی دوسری شکل ہو گی ؟ صرف اسی ایک سوال کے جواب میں فرق سے زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جائے گا۔ اس سے ملتے جلتے اور بھی بہت سارے سوالات ہیں جن کا تذکرہ آگے آئے گا۔ یہ دوسرا علم جو کلی حقائق سے بحث کرتا ہے' فلسفہ کا موضوع ہے اور یہی درحقیقت ایمان کا موضوع ہے۔

فلسفہ کی حقیقت

انسان نے ایسے اصولی سوالوں کا جواب جاننے کے لئے عقل کے گھوڑے دوڑائے' منطق سے مدد لی۔ اس طرح حواسِ خمسہ کے ذریعے اسے جو معلومات حاصل تھیں ان کو جوڑا اور جمع کیا' نتائج اخذ کئے اور اس طرح اپنے علمی و عقلی سفر کو جاری رکھا۔ اس عمل کے ایک حصے کو استخراجی اور دوسرے حصے کو استقرائی طریق کار کا نام دیا گیا۔ فلسفہ جن اصولی سوالات سے بحث کرتا ہے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے :

۱) میں کون ہوں ؟ یعنی انسان کی حقیقت کیا ہے ؟
۲) زندگی کس چیز کا نام ہے ؟
۳) خیر کسے کہتے ہیں اور شر کی کیا حقیقت ہیں ؟
۴) علم کی حقیقت کیا ہے ؟

۵) وجود کی ماہیت کیا ہے؟

۶) زندگی کا آغاز کیا ہے؟ اور اختتام کیا ہے؟ وغیرہ

عام آدمیوں اور تقلیدی مزاج کے لوگوں کے نزدیک تو ان سوالات کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہوتی، لیکن تاریخ کی یہ گواہی موجود ہے کہ تحقیقی مزاج کے لوگوں کے ذہن میں جب یہ سوالات پیدا ہو گئے تو انہیں زندگی کی کسی اور چیز سے دلچسپی ہی نہیں رہی [۲]۔ ان کا داعیۂ تلاشِ حق اتنا شدید ہوتا ہے کہ خود اپنی زندگی

---

۲) گوتم بدھ جو کہ کپل وستو کا شہزادہ تھا، تیس سال کی عمر میں جوان بیوی، شیر خوار بچے، راجدھانی اور محل کو چھوڑ کر جنگلوں میں نکل گیا۔ حالانکہ عام انسانوں کے لئے یہ سہولتیں اور عیش و عشرت کا سامان پاؤں کی بیڑی بن جایا کرتی ہیں۔ لیکن گوتم بدھ کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ اس نے دیکھا کہ کوئی اندھا ہے اور لڑکھڑا رہا ہے، گر رہا ہے، کسی کا بچہ فوت ہو رہا ہے، رشتہ دار، والدین سرہانے کھڑے ہیں لیکن کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس نے سوچا یہ رنج اور الم کیوں ہے؟ اور اس سے نجات کا کوئی راستہ ہے یا نہیں؟ کوئی اگر پیدائشی اندھا ہے تو آخر اس کا قصور کیا تھا؟ حقیقت کیا ہے؟ ان تمام چیزوں سے نجات کی کوئی شکل ہے یا نہیں؟ ان سوالوں کا جواب پانے کے لئے اس نے کہاں کہاں کی خاک چھانی، کس کس کی خدمتیں کیں، کیسی کیسی ریاضتیں کیں! ہم نے صرف مثال سامنے رکھنی ہے، کسی کی تعلیمات پر تبصرہ ہمارے یہاں پیش نظر نہیں ہے۔

اسی طرح ذرا غور کیجئے، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر کیا پتا پڑی تھی، کیوں گھر سے نکلے تھے؟ حالانکہ اپنے وطن ایران میں وہ پر سکون زندگی گزار رہے تھے، وہ آتش پرست حلقے کے ایک صاحب حیثیت شخص کے بیٹے تھے، گدی ملی ہوئی تھی، ہمیشہ کے لئے عیش کرتے لیکن وہی تحقیقی مزاج آڑے آیا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ ہم خود آگ جلائیں، خود ایندھن ڈالیں اور خود اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر عبادت کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ اس سے بڑی اور کیا حماقت ہو گی۔ پھر انہوں نے تلاش حق میں کہاں کہاں کی خاک چھانی! گھر چھوڑا، ہجرت کی، شام تک کا سفر کیا، عیسائیت اختیار کی، کبھی ایک راہب کے پاس، کبھی دوسرے عالم کے پاس اور آخری راہب کی جب موت کا وقت آیا تو کہا کہ میری تو اب تک تسکین نہیں ہوئی، اب تمہارے بعد میں کہاں جاؤں؟ تو اس راہب نے بتایا کہ میرا علم بتاتا ہے کہ آخری نبی کے ظہور کا وقت آ چکا ہے اور جنوب کی طرف (باقی اگلے صفحہ پر)

کی کوئی اہمیت و حقیقت ان کے نزدیک باقی نہیں رہتی' بلکہ اصل اہمیت ان مسائل کی الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے اور ان کے جوابات کے حصول کی ہوتی ہے۔

پانچ اہم ترین سوال

ہر انسان سے خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی' مسلمان ہو یا کافر' تابع فرمان مؤمن ہو یا بے عمل مسلمان' بہرحال قیامت کے روز پانچ سوال ضرور پوچھے جائیں گے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر شخص ان سوالوں کا ایک معین جواب اپنے ذہن میں رکھتا ہے جس کا کسی قدر اظہار اس کے رویئے اور کردار سے ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں ان سوالوں کی تفصیل ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((لَا تَزُولُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ حَتّٰى يُسْاَلَ عَنْ خَمْسٍ : عَنْ عُمُرِهِ فِيمَا اَفْنَاهُ' وَعَنْ شَبَابِهِ فِيمَا اَبْلَاهُ' وَعَنْ مَالِهِ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهُ' وَفِيمَا اَنْفَقَهُ' وَمَاذَا عَمِلَ فِيمَا عَلِمَ)) (۳)

(گزشتہ سے پیوستہ) کھجوروں کی زمین میں اس کا ظہور ہو گا۔ جاؤ اور تلاش کرو۔ بالآخر حضرت سلمان الفارسیؓ وہاں سے ایک قافلہ کے ہمراہ نکلے۔ راستے میں ڈاکوؤں کا حملہ ہوا' گرفتار ہوئے' غلام بنے۔ خریدار چونکہ مدینہ کا یہودی تھا لہٰذا اس طرح مدینہ طیبہ پہنچے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں پہنچنے کی سبیل پیدا ہو گئی اور اس طرح تلاش حق کا یہ سفر مکمل ہوا۔(واضح رہے کہ اس وقت تک آنحضور ﷺ ابھی ہجرت کر کے یثرب تشریف نہیں لائے تھے۔)

(۳) سنن الترمذی:۲۵۴۴' ابواب صفه القیامه' باب شان الحساب والقصاص۔ و مسند ابی یعلی الموصلی:۵۲۷۱' ۱۷۸/۹۔ والمعجم الصغیر للطبرانی:۷۶۰' ۲۸۰/۱ اور تاریخ بغداد للخطیب ۴۴۰/۱۲۔ یہی حدیث حضرت ابو برزہ الاسلمی کے حوالے سے بھی مروی ہے' ملاحظہ ہو سنن الترمذی:۲۵۴۵ و مسند ابی یعلی الموصلی:۷۴۳۴' ۴۲۸/۱۳ واقتضاء العلم العمل للخطیب ص ۱۲۔۱۷ وحلیة الاولیاء لابی نعیم الاصفهانی ۲۳۲/۱۰ و سنن الدارمی:۵۴۵ ۱۳۵/۱' نیز (باقی اگلے صفحہ پر)

"قیامت کے روز کسی آدم زادے کے قدم اس وقت تک اپنے رب کے سامنے سے نہ ہٹ سکیں گے جب تک کہ اس سے مندرجہ ذیل پانچ سوال نہیں پوچھ لئے جاتے :

۱) اس نے اپنی عمر کہاں خرچ کی؟
۲) اپنی جوانی کہاں کھپائی؟
۳) مال کو کہاں سے کمایا؟
۴) اور کہاں خرچ کیا؟
۵) علم کے مطابق کس قدر عمل کیا؟"

مذکورہ بالا سوالات کی مانند پانچ ہی سوال مابعد الطبیعیاتی یا غیبی امور سے متعلق ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں ہر انسان نے شعوری یا غیر شعوری طور پر کوئی نہ کوئی جواب اختیار کیا ہوا ہے اور اس کے مطابق اپنے طرز زندگی کو استوار کیا ہوا ہے' چاہے متعین شکل میں یہ سوالات کبھی اس کے سامنے آئے ہوں یا نہ آئے ہوں۔

سوال ① کائنات کی حقیقت کیا ہے؟

پہلا اور بنیادی سوال کائنات کے بارے میں ہے کہ کیا یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی؟ کیا یہ خود بخود بن گئی ہے اور خود بخود چل رہی ہے؟ کیا یہ کسی وقت معین پر تخلیق ہوئی ہے؟ اور کیا کسی وقت معین کے بعد ختم ہو جائے گی؟ اگر واقعتاً یہ کائنات تخلیق ہوئی ہے تو اس کا خالق کون ہے؟ اگر کوئی خالق ہے تو اس کی صفات کیا ہیں؟ خالق اور کائنات (مخلوق) کا باہم ربط و تعلق کیا ہے؟ اور اس سے رابطے کی کوئی شکل ہے یا نہیں؟

(گزشتہ سے پیوستہ) حضرت معاذ بن جبل کے حوالے سے خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد ۴۴۱/۱۱ میں اور اقتضاء العلم العمل ص ۱۸-۱۹ میں بیان کیا ہے۔ اس حدیث کو پوری تفصیل سے اس لئے ذکر کیا گیا ہے تا کہ معلوم رہے کہ یہ حدیث انتہائی مستند ہے اور محدثین کرام نے اسے پورے اہتمام سے بیان کیا ہے (مرتب غفر اللہ لہ)

یہ تفصیلی سوالات پہلے بنیادی سوال کی تشریح کا درجہ رکھتے ہیں۔

سوال ② خود میں کون ہوں؟

میری حقیقت کیا ہے؟ مشہور صوفی شاعر حضرت بلھے شاہ نے کہا : "بلھیا کی جاناں میں کون؟ (Who am I?) کیا میں بھی دوسرے حیوانات کی طرح بس ایک حیوان ہوں؟ یا ان سے کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے مختلف ہوں؟ مجھ میں اور حیوانات میں اگر کوئی فرق ہے تو کیا ہے؟ اور اس کائنات میں میرا اصل مقام کیا ہے؟

سوال ③ میری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟

کیا پیدائش سے موت تک کا عرصہ ہی میری کل زندگی ہے؟ کیا موت پر زندگی کا اختتام ہو جائے گا؟ یا موت کی سرحد کے پار بھی میرے وجود کا کوئی تسلسل ہے؟ اگر ہے تو اس کی کیا شکل ہے؟ اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ اس کی کیفیات کیا ہوں گی! اس مرکزی سوال کے اندر ایک دوسرا سوال موجود ہے' اور وہ یہ کہ اس دنیا میں آنے یعنی پیدائش سے پہلے بھی میرا کوئی وجود تھا؟ اگر تھا تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ میں کہاں سے آیا ہوں اور میری منزل کون سی ہے؟

سوال ④ علم کی حقیقت کیا ہے؟

ایک علم سے تو ہم سب واقف ہیں جو حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتا ہے۔ آنکھ دیکھتی ہے' کان سنتے ہیں' اسی طرح چھو کر' چکھ کر اور سونگھ کر بھی کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ (اضافی قوتِ حاسہ (Extra Sensory Perceptions) کو بھی اس دور میں اہمیت دی جانے لگی ہے تاہم اس کا معاملہ چونکہ کسی قدر متنازعہ ہے لہٰذا اسے سردست علیحدہ رکھئے۔) بہرحال حواس خمسہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں۔ اسی طرح انسان یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر کوئی کمپیوٹر ہے جو نتیجہ نکالنے میں معاون ہوتا ہے۔ یعنی استنباط و استدلال کی قوت سے دو موجود

حقیقتوں کے ذریعے تیسری حقیقت معلوم کرنے کی صلاحیت اس کے اندر موجود ہے۔ کچھ کلی معلومات بھی اس کے اندر ودیعت شدہ ہیں۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ جہاں آگ جلتی ہے وہاں دھواں بھی ہوتا ہے' لہٰذا دھوئیں کو دیکھ کر ہم بآسانی یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ وہاں آگ لگی ہوئی ہے' حالانکہ اپنی آنکھوں سے آگ کو ہم نے نہیں دیکھا بلکہ دماغی کمپیوٹر نے دھواں دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔

علم کے یہ دو دائرے یا دو ذرائع یعنی علم بالحواس اور علم بالعقل تو ہر باشعور انسان کے علم میں ہیں' البتہ شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ کے قول کے مطابق علم انسانی کے تین دائرے ہیں : (۱) علم بالحواس (۲) علم بالعقل (۳) علم بالقلب۔ پہلے دو ذرائع علم کے بارے میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہے' سوال یہ ہے کہ علم بالقلب کی بھی کوئی حقیقت ہے یا نہیں؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آیا علم بالحواس اور علم بالعقل سے پرے بھی کوئی Source of knowledge ہے یا نہیں!

سوال⑤ خیر و شر کی حقیقت کیا ہے؟

کیا یہ کوئی مستقل اقدار (permanent values) ہیں؟ یہ اقدار حقیقی ہیں یا محض وہمی اور خیالی؟ انگریزی زبان کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ :

"*Nothing is good or bad, only thinking makes it so*".

"کوئی چیز اپنی ذات میں نہ اچھی ہے نہ بری' بلکہ انسانی سوچ اسے اچھا یا برا بنا دیتی ہے"۔

کیا یہ مقولہ صحیح ہے؟ کیا ہم نے ایسے ہی کسی شے کو خیر اور کسی کو شر کا نام دے رکھا ہے یا واقعتاً یہ مستقل اقدار (values) ہیں؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو خیر پر آمادہ کرنے والا جذبۂ محرکہ کون سا ہے' چاہے اس خیر کو اپنانے میں نقصان ہو رہا ہو؟ سچ بولنا اگر خیر ہے لیکن سچ بولنے میں اگر دنیاوی نقصان ہوتا ہو تو انسان پھر کیوں سچ بولے؟ جھوٹ بولنا اگر شر ہے لیکن جھوٹ بولنے میں اگر

فائدہ نظر آتا ہو تو جھوٹ کیوں نہ بولے؟

اگر خیر و شر مستقل اخلاقی قدریں ہیں تو پھر ان اقدار پر عمل پیرا ہونے کے لئے مضبوط جذبۂ محرکہ بھی درکار ہے۔ یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر دیانت خیر اور خیانت شر ہے تو انسان کو دیانت اور امانت پر قائم رکھنے اور خیانت سے روکنے والی قوت کون سی ہے؟

یہ پانچ سوال ہیں جو مابعد الطبیعیات اور فلسفہ کے مختلف شعبوں میں مرکزی اہمیت کے حامل ہیں۔ علم نفسیات (Psychology) انسان کی باطنی حقیقت سے بحث کرتا ہے۔ انسان کے محرکات عمل کیا ہیں؟ آیا وہ صرف حیوان ہی ہے یا اس سے مختلف ہے؟ اس کا behaviour کیا ہے؟ علم الاخلاق (Ethics) میں خیر و شر کی حقیقت زیر بحث آتی ہے کہ اگر یہ آفاقی اقدار ہیں تو ان کے لئے جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ اخلاقیات کا نظام کون سا ہو؟ وغیرہ۔ مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کائنات کی حقیقت پر بحث کرتی ہے کہ وجود کی حقیقت و ماہیت کیا ہے۔ اسی طرح علمیات (Epistemology) میں حقیقت علم اور ماہیت علم سے بحث کی جاتی ہے۔ الغرض یہ سب فلسفہ ہی کی شاخیں ہیں۔ اور یہی وہ پانچ بنیادی سوالات ہیں جن سے ایمان بحث کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ فلسفہ اور ایمان دونوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ دونوں مابعد الطبیعیاتی حقائق سے بحث کرتے ہیں۔

ان سوالات کے جوابات تاریخ انسانی میں دو طریقوں سے پیش کئے گئے۔ ایک طریقہ وہ ہے جو حکماء اور فلاسفہ نے اختیار کیا۔ انہوں نے عقل و منطق کے گھوڑے دوڑائے، حواس کے ذریعے جو معلومات انہیں حاصل ہوئیں عقل کی قوتوں کو بروئے کار لا کر ان کی مدد سے نظریات مدوّن کئے۔ چنانچہ حقیقت کے بارے میں مختلف نظریات، جن میں تصوریت (idealism) اور مادیت (materialism) نمایاں ہیں، وجود میں آئے۔ فلسفے کے بارے میں یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اس میں یقین نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ ہر بات کی بنیاد ظن، تخمین، گمان، اندازے اور قیاس پر ہوتی

ہے۔ فلسفی حضرات اپنے نظریات کو بالعموم اس قسم کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ ”ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے“ یا یہ کہ ”ہمارا یہ خیال ہے“ وغیرہ' اور جو کوئی جتنا بڑا فلسفی ہو گا اسی قدر وہ اپنے نظریات کو عاجزانہ انداز میں پیش کرے گا۔

اس کی ایک نمایاں مثال خود علامہ اقبال ہیں۔ انہوں نے اپنے خطبات (یعنی ”تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ“) کے مقدمہ میں تسلیم کیا ہے کہ ”میں یہ نہیں کہتا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ حرفِ آخر ہے' ہمارا کام ہے کہ علمی رویئے کو برقرار رکھتے ہوئے غور و فکر کو آگے بڑھائیں' ہو سکتا ہے کہ ان خطبات میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں ان سے بڑھ کر اور بہتر خیالات سامنے آ جائیں۔“ حکیم الاُمت جیسا عظیم فلسفی بھی اپنے فلسفیانہ افکار و خیالات کو اس عاجزی اور انکساری کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حرف آخر ہے۔ البتہ دنیا میں بڑے بڑے فلسفے موجود ہیں جنہوں نے ایک عالم کو مسخر کر رکھا ہے۔ ان کی تاثیر اور اثر پذیری سے انکار ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ بعض مذاہب کو بھی فلسفیانہ مذاہب (Philosophical Religions) کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کی بنیاد وحی کے بجائے فلسفہ پر ہے۔

لیکن تاریخ انسانی میں ان سوالات کا دوسرا جواب کچھ لوگ اس دعوے سے دیتے ہیں کہ ہمیں ایک خاص ذریعے (source) سے علم حاصل ہوا' یعنی نہ تو یہ ہمارا اپنا ذاتی خیال ہے' اور نہ ہی منطقی صغریٰ کبریٰ ملا کر ہم نے کوئی نتیجہ نکالا ہے اور نہ ہی یہ ہمارے غور و فکر کا حاصل ہے' بلکہ یہ وحیِ آسمانی ہے : ﴿ اِنْ هُوَ اِلاَّ وَحْیٌ یُّوْحٰی ﴾[۴] ہے۔ وحی کی بنیاد پر علم کا دعویٰ کرنے والوں نے کہا صرف یہی حق ہے اور اس کی حقانیت میں کسی شک و شبہ کی بھی گنجائش نہیں۔ فرمایا : ﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لاَ رَیْبَ فِیْهِ ﴾[۵] یہ دعویٰ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ کسی بھی فلسفی نے یہ بات

---

(۴) سورۃ النجم آیت نمبر۴' ”یہ تو ایک وحی کی تعلیم ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔“

(۵) سورۃ البقرۃ آیت نمبر۲' ”یہ الکتاب ہے' اس میں کوئی شک نہیں“۔

کبھی نہیں کہی' اگر کہی تو صرف اللہ کے رسول اور نبی نے کہی اور وہ یہ بات اپنے اپنے وقت میں بڑے دعوے کے ساتھ کہتے رہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو مخاطب کرکے فرمایا :

﴿ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۝ ﴾ (مریم : ۴۳)

"ابّا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا تھا' پس آپ میری پیروی کیجئے' میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا!"

تجرباتی علم باپ کے پاس زیادہ تھا' کیونکہ اس کی عمر زیادہ تھی' اس کا تجربہ بیٹے کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا' وہ کہہ سکتا تھا کہ تم کل کے بچے ہو' میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں' تم مجھے کہہ رہے ہو کہ میری پیروی کرو! کس بنیاد پر؟ آخر کوئی بنیاد تو ہونی چاہئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں جو دلیل پیش فرمائی وہ لائق توجہ ہے' فرمایا :

"ابّاجان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا"۔

اس علم تک تمام انسانوں کی رسائی ممکن نہیں۔ یہ ذریعۂ علم کچھ اور ہی ہے۔ حواس یا عقل کو اس کا منبع یا سرچشمہ قرار نہیں دیا جا سکتا' بلکہ اس کا ذریعہ اور سرچشمہ (source) وحی ہے۔ اسی لئے اس کے بارے میں صاف فرمادیا گیا کہ : ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴾۔ چنانچہ اس علم کی بنیاد پر انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم ہر دور میں اپنی قوم سے یہ مطالبہ کرتے رہے کہ ہماری پیروی کرو' ہمارا اتباع کرو۔

لوگوں کے عقل وشعور کی سطحیں (Levels of Consciousness) بھی مختلف ہوا کرتی ہیں۔ علم' فہم اور شعور کے اعتبار سے تمام انسان چونکہ ایک سطح پر نہیں ہیں لہٰذا وحی الٰہی کے ذریعے ملنے والے جوابات کی بھی چار سطحیں ہیں۔

پہلی سطح کو عام فہم سطح کا نام دیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم اور حدیث رسول اکرم

[illegible] نے بنیادی طور پر اسی سطح پر گفتگو کی ہے کیونکہ قرآن "هُدًى لِّلنَّاسِ" ہے۔ ظاہر بات ہے کہ "النّاس" میں ان پڑھ کاشتکار اور مزدور قسم کے لوگ بھی شامل ہیں۔ اس سطح کو ایک عالم اور فلسفی سے لے کر عام آدمی تک ہر انسان سمجھتا ہے، حتیٰ کہ صحراء میں بسنے والے بدو اور اَن پڑھ بھی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ قرآن حکیم میں اونچے فلسفیانہ حقائق زیرِ بحث آئے ہی نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اعلیٰ فلسفیانہ مضامین قرآن حکیم میں بالعموم ضمنی طور پر آئے ہیں اور مخفی انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ ایک حکیم اور فلسفی اس مقام پر ڈیرہ ڈال لیتا ہے جبکہ عام انسان ان سے سرسری طور پر گزر جاتا ہے۔ عافیت بھی اسی میں ہے کہ عام انسان سرسری ہی گزر جائے۔ واضح رہے کہ ان دقیق معانی کے بغیر بھی رشد و ہدایت کا مدعا پورا ہو رہا ہوتا ہے۔ میں نے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" نامی کتابچے میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے کہ ایک ہے "تذکر بالقرآن" اور ایک ہے "تدبرِ قرآن"۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً اگر تیل سمندر میں گر جائے تو وہ پانی کی سطح پر ایک باریک تہہ کی صورت میں پھیل جاتا ہے، نیچے نہیں جاتا۔ یوں سمجھئے کہ قرآن کی ہدایت کا لبِ لباب اس کی اوپر والی سطح پر موجود ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی بھی نہ ہو کہ قرآن حکیم کی ساری تعلیم بس یہی کچھ ہے بلکہ اس کی گہرائی تو ناپی ہی نہیں جا سکتی۔ اس کی عام تعلیمات اس تیل کی مانند ہیں جو سمندر کے اوپر نظر آ رہا ہے، جبکہ یہ خود سمندر سے زیادہ گہرا ہے۔ چنانچہ ان سوالات کا ایک جواب عام فہم سطح کا ہے۔ قرآن و حدیث نے بطرزِ جلی اسی کو اختیار کیا ہے۔

دوسری سطح کو ہم متکلمانہ سطح کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کو عقل و منطق کے حوالے سے سمجھنا۔ اس متکلمانہ سطح کے ہمارے ہاں تین گروپ پیدا ہوئے ہیں۔ اشاعرہ، ماتریدیہ اور معتزلہ۔ اشاعرہ ایک انتہا پر ہیں تو معتزلہ دوسری پر۔ معتزلہ انتہائی عقلیت پسند (Rationalist) ہیں جنہیں عقلیت پرست بھی ہیں۔ اشاعرہ اس کے برعکس اور ماتریدی درمیان میں ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں

نے عقائد کو مرتب کیا ہے۔ عقائد کی جو کتابیں ہیں وہ در حقیقت ان ایمانی حقائق کی منطقی تعبیرات ہیں۔ یہی لوگ اپنے دور میں علم و منطق کو جاننے والے تھے۔ انھوں نے اس کی تعبیر کی ہے۔ البتہ ان لوگوں کے بیان کردہ حقائق ہرگز حرفِ آخر نہیں ہیں۔ عقائد یا عقیدہ کا لفظ بھی قرآن یا حدیث کی اصطلاح نہیں ہے یہ علم کلام کی اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کا آغاز بعد میں ہوا۔

ان سوالات کے جوابات کی تیسری سطح فلسفیانہ ہے۔ ہمارے ہاں ابن سینا، فارابی اور ابن رشد نے خالص فلسفہ کی بنیاد پر دینی حقائق کی تعبیریں کی ہیں جبکہ متکلمین اسلام نے فلسفہ کو کتاب و سنت کے ساتھ جوڑنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔

اس سلسلے کی چوتھی سطح وہ ہے جسے ہم صوفیانہ سطح کا عنوان دے سکتے ہیں۔ گہرائی کے اعتبار سے صوفیاء کے تصورات سب سے گہری سطح پر ہیں۔ انھوں نے حقائق کی تعبیر وجدانی کیفیت کے ساتھ یعنی علم بالقلب کے ذریعے کی ہے۔ گویا کہ صوفیاء نے علم کلام یا فلسفہ کی بجائے وجدانی قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنی باطنی کیفیات کے حوالے سے ان حقائق کا ادراک کیا ہے۔

یہ چار سطحیں ہیں، لیکن ہماری گفتگو بنیادی اور پہلی سطح یعنی عام فہم سطح کے حوالے سے ہو گی۔ البتہ کہیں کہیں تعبیرات کے ضمن میں متکلمانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ سطحوں کا حوالہ بھی آئے گا۔

ایمان قرآن و حدیث کی اصطلاح ہے چنانچہ ان سوالات کے جوابات کے ضمن میں ہماری گفتگو بھی قرآن و حدیث کے ارد گرد رہے گی۔ اور ہم ان ہی کے حوالے سے ان بنیادی سوالات کے، جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، ان جوابات پر غور کریں گے جو وحی سے حاصل ہوئے ہیں اور جن کا مجموعی نام ”ایمان“ ہے۔

س ①: کائنات کی حقیقت کیا ہے؟

ج: یہ کائنات نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہمیشہ رہے گی۔ یہ ایک خاص وقت تک کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا

بَيْنَهُمَآ اِلاَّ بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ط ﴾ "(الروم:٨ اور اسی معنی میں الاحقاف:٣)
"اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدتِ مقرر کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔"

البتہ ایک ہستی ایسی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی' ہمیشہ رہنے والی یہ ہستی خالق ہے اور فنا ہونے والی مخلوق ہے۔ اسی ہستی نے ساری کائنات کو پیدا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (التّغابن : ٣)

"اس نے زمین اور آسمانوں کو برحق پیدا کیا ہے اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ صورت بنائی ہے اور اس کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے"۔

اس خالق ذات کو تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر' بات ایک ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ج ﴾ (بنی اسرآءیل : ١١٠)

"(اے نبی ان سے) کہو! اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر' جس نام سے بھی پکارو اس کے لئے سب اچھے ہی نام ہیں"۔

اس کی ہستی یکتا ہے' از خود اور باخود ہے' نہ اس کے والدین ہیں نہ اولاد اور نہ بیوی' وہ بالکل تنہا ہے' نہ اس کا کوئی مثل ہے' نہ مثیل ہے نہ مثال' نہ ضد ہے اور نہ ند (مقابلے کا فرد)۔ اس کا کفو' ہمسر اور مدمقابل کوئی ہے ہی نہیں۔ اس ضمن میں آخری بات اس آیت کریمہ میں فرمادی گئی :

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ج ﴾ (الشوریٰ : ١١)

"نہیں ہے اس کی طرح کا سا کوئی"۔

دوسری جگہ فرمایا :

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ○ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ○ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ○ ﴾ (الاخلاص)

"کہو : وہ اللہ یکتا ہے۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے' اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے"۔

وہ ہستی ہر ضعف' عیب اور ہر احتیاج سے اعلیٰ و ارفع ہے' مبرا اور منزہ ہے۔ گویا کہ ہر اعتبار سے کامل ہستی اور سبوح و قدوس ذات ہے جس اعلیٰ و اشرف صفت یا قدر کا بھی تصور کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس صفت سے بتمام و کمال متصف ہے۔ مثلاً زندگی ایک اعلیٰ قدر ہے تو اللہ تعالیٰ "اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ" ہے۔ وہ زندہ ہے اور اس کی زندگی مستعار نہیں' بلکہ اس کی ذاتی ہے' وہ ساری کائنات کو اپنی کمالِ قدرت سے تھامے ہوئے ہے۔ اسی طرح علم ایک اعلیٰ قدر ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ "بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" ہے' ہر چیز کا پوری طرح اور ہمیشہ سے علم رکھنے والا ہے۔

قدرت ایک اعلیٰ قدر ہے اور اس کی ذات "عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" ہے' یعنی اسے ہر شے کی قدرت حاصل ہے۔" اور "وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ" یعنی وہ اپنے علم اور قدرت کے ساتھ ہر جگہ اور ہر آن تمہارے ساتھ ہی موجود ہے۔

اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں' اس کی صفات میں کوئی شامل نہیں' اس کے حقوق میں کوئی ہمسر اور ساجھی نہیں۔ اس کے جملہ حقوق ایک لفظ "عبادت" میں آجائیں گے۔

"وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق"

لہٰذا عبادت صرف اور صرف اسی کی کی جائے گی' خواہ وہ انفرادی عبادت ہو یا اجتماعی عبادت' یعنی ایک فرد کے ذاتی معاملات سے لے کر پوری قوم اور ملت کے اجتماعی معاملات اور نظامِ حکومت و حکمرانی تک اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی اور اسی کا حکم

چلنا چاہیے۔ فرمایا: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾(۶) نیز فرمایا: ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾(۷) خلق بھی اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے اور حکم بھی اسی کا چلے گا۔ اس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں۔ فرمایا: ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا﴾(۸) وہ اپنے اختیار، حکم اور حکمرانی میں کسی دوسرے کو شریک کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان سب چیزوں کو جمع کر کے ترتیب دے لیں تو اس کا نام ایمان باللہ یا توحید ہے۔ فلسفیانہ اور منطقی بلند آہنگی میں کہیں گے کہ خالق کی ذات واجب الوجود ہے اور ساری مخلوق یعنی سارا عالم کائنات ممکن الوجود ہے اور یہ کلیہ ہے کہ ممکن الوجود اپنی حقیقت اور اصل کے اعتبار سے معدوم کے درجے میں ہوتا ہے [illegible] چند [illegible] کہیں ہوتا کہ [illegible] نہیں تھا [illegible] اور بقول غالب [illegible]

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

مزید گہرائی میں جائیے تو صوفیاء تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ وجودِ حقیقی صرف اسی کا ہے' باقی جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ محض خیالی ہے [illegible]

كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خَيَالٌ
اَوْ عُكُوْسٌ فِي الْمَرَايَا اَوْ ظِلَالٌ

یعنی ساری کائنات سایہ یا عکس ہے' یا وہم و خیال کی بات ہے۔ گویا کہ وجودِ حقیقی صرف ایک ذات کا ہے۔ اسے آپ چاہے وحدت الوجود کے اعتبار سے تعبیر کیجئے یا وحدت الشہود کے اعتبار سے' یہ ایک ہی ہستی کی تعبیر ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی رائے اس ضمن میں بالکل قولِ فیصل ہے' جس کا میں قائل ہوں' کہ ان دونوں میں تعبیر ہی کا بال برابر فرق ہے' کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔

---

(۶) سورۃ الانعام آیت ۵۷ و سورۃ یوسف آیت ۴۰ اور ۶۷
(۷) سورۃ الاعراف آیت ۵۴
(۸) سورۃ الکہف آیت ۲۶

ہماری بات کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات خالق اور باقی ساری کائنات مخلوق ہے۔ اللہ کی ذات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ﴾ (القصص: ۸۸)

"ہر شے ہلاک ہو جانے والی ہے سوائے اس کے روئے انور کے۔"

نیز فرمایا:

﴿وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ﴾ (الرحمٰن: ۲۷)

"اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔"

گویا کہ ہر شے فانی ہے، باقی صرف وہی ہے، ازلی و ابدی وجود صرف اسی کا ہے، وہ تنہا ہے اپنی ذات میں، اپنی صفات میں، اپنے حقوق میں، اپنے اختیارات میں اور وہ کسی کو اپنے اختیارات میں شریک نہیں کرتا ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا﴾ (الکہف: ۲۶) البتہ ساری کائنات حادث اور فانی ہے، ایک وقت پر پیدا ہوئی اور ایک خاص وقت کے لئے ہے، ہمیشہ کے لئے نہیں ہے۔

﴿مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (الاحقاف: ۳)

"ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں، برحق اور ایک مدتِ خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا ہے۔"

دوسرا بنیادی سوال جو ہر ذی شعور انسان کو بے چین رکھتا ہے وہ اس کی اپنی حقیقت کے بارے میں ہے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کا کائنات میں مقام کیا ہے؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لانے کے نتیجے میں انسان کو اس اہم سوال کا اطمینان بخش جواب مل جاتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اور اسے خلافت عطا فرمائی۔ یہ انسان جملہ کائنات پر برتر مقام رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا climax (نقطۂ کمال) ہے۔ گویا کہ اب تک جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اس میں

بلند ترین وجود انسان کا ہے' جس کے اسباب درج ذیل ہیں :

۱ ۔ قرآن حکیم میں سات مقامات[9] پر فرمایا گیا کہ ہمارے حکم سے تمام فرشتوں نے انسان کو سجدہ کیا۔ فرمایا :

﴿ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ ﴾ (الحجر : ۳۰)

"پھر سب کے سب فرشتوں نے اکٹھے ہو کر سجدہ کیا"۔

۲۔ انسان کی عظمت و عزت کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا :

﴿ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ ﴾

(بنی اسراءیل : ۷۰)

"(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ) ہم نے بنی آدم کو فضیلت عطا کی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں' اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی"۔

۳ ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا' فرمایا :

﴿ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ ﴾

(ص : ۷۵)

"اے ابلیس! تجھے کیا چیز اس کو سجدہ کرنے سے مانع ہوئی جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟"

یہ آیت عظمت انسان کی عظیم دلیل ہے۔

"خَلَقْتُ بِيَدَيَّ" سے مراد کیا ہے؟ دونوں ہاتھوں سے مراد دو عالم ہیں' ایک عالم خلق اور دوسرا عالم امر۔ جملہ مخلوقات یا عالم خلق سے متعلق ہیں یا عالم امر سے' البتہ انسان کے وجود میں یہ دونوں عالم آکر جمع ہو گئے ہیں' اس کے وجودِ حیوانی کا تعلق "عالم خلق" سے ہے' اس اعتبار سے یہ مادی اور زمینی مخلوق ہے۔ اسی لئے

---

۹) سورۃ البقرہ آیت نمبر ۳۴' سورۃ الاعراف آیت نمبر ۱۱' سورۃ الحجر آیت نمبر ۳۰' سورۃ الاسراء آیت نمبر ۶۱' سورۃ الکہف نمبر ۵۰' سورۃ طٰہٰ نمبر ۱۱۶' سورۃ ص آیت نمبر ۷۳۔

تو فرمایا :

﴿ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴾
(طٰهٰ : ۵۵)

”اس زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا' اسی میں تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے“۔

اور اس کے وجودِ روحانی کا تعلق ”عالم امر“ سے ہے' فرمایا :

﴿ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّىْ ﴾ (بنی اسراء یل : ۸۵)

”کہہ دیجئے یہ روح میرے ربّ کا ”امر“ ہے“۔

واضح رہے کہ ملائکہ کا تعلق صرف عالم امر سے ہے اور جنات کا تعلق صرف عالم خلق سے ہے' ان میں روح نہیں ہوتی' جبکہ انسان زمینی مخلوق ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب روح بھی ہے' اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا :

﴿ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ فَقَعُوْا لَهٗ سَاجِدِيْنَ ○ ﴾
(الحجر : ۲۹' ص : ۷۲)

”پھر جب میں اس کی نوک پلک سنوار کر تکمیل کر دوں اور اس میں اپنی طرف سے روح پھونک دوں تو اس کے سامنے سجدے میں گر جانا“۔

چونکہ روحِ انسانی کا تعلق براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے' اس لئے جس طرح ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں کوئی تشبیہہ نہیں دی جا سکتی اسی طرح جو شے اس ذات بابرکات سے متعلق ہے اس کے لئے بھی کوئی تشبیہہ نہیں ہو سکتی۔

اتصالِ بے تکیُّف بے قیاس
ہست ربّ الناس را با جانِ ناس

کہ روح کے حوالے سے اللہ اور بندے کے درمیان ایک اتصال کی کیفیت موجود ہے' لیکن اس اتصال (contact) کو کسی اور اتصال پر قیاس نہیں کر سکتے' اس اتصال کی کیفیت کو نہیں جان سکتے۔ قرآن حکیم میں آیا ہے :

﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ○ ﴾ (ق : ۱۶)

"اور ہم اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں"۔

۴۔ انسان میں اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے روح پھونکی' اور یہی روح جملہ انسانوں اور حیوانوں کے درمیان وجہ امتیاز ہے۔ زندگی حیوانوں میں بھی ہوتی ہے اور انسانوں میں بھی' اس اعتبار سے حیوانی وجود دونوں کے پاس ہے لیکن اس پر مستزاد انسان کا ایک روحانی وجود بھی ہے اور یہی انسان کے لئے وجہ امتیاز ہے۔ اسی لئے وحی صرف اسی کو ہوتی ہے کیونکہ وحی درحقیقت contact ہے روح کا روح کے ساتھ۔ فرمایا:

﴿ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ ﴾ (البقرۃ: ۹۷)

"بلاشبہ جبریلؑ نے اس قرآن کو تمہارے دل پر نازل کیا ہے"۔

نیز فرمایا:

﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ ﴾ (الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۴)

"اس قرآن کو لے کر روح الامین تمہارے دل پر نازل ہوا ہے"۔

کسی نے خوب کہا ہے:

"نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو روح سنے اور روح سنائے"

روح الامین نے نغمہ سرمدی یعنی قرآن مجید سنایا ہے روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو۔

۵۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق فرمایا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ)) (۱۰)

"اللہ تعالیٰ نے آدم کی تخلیق اپنی صورت پر کی"۔

معاذ اللہ' اللہ تعالیٰ کی شکل سے مراد آنکھ کان وغیرہ کی مشابہت نہ لیجئے' بلکہ بطور استعارہ فرمایا گیا ہے۔ بہرحال خالق سے کوئی نہ کوئی مشابہت تو ضرور ہے۔

(۱۰) صحیح البخاری' کتاب الاستیذان' باب بدء السلام' ح ۵۸۷۳ وصحیح مسلم' کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا' باب یدخل الجنۃ اقوام..... الخ' ح ۲۸۴۱

الا ھو وَاللّٰہِ لَتموتُنَّ کما تناموںِ ' ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کما تَستیقظون ' ثم لَتُحَاسَبُنَّ لِمَا تَعملون ' ثم لَتُجْزَوُنَّ بالاحسانِ احسانًا وبِالسُّوْءِ سُوءً ' وانّھالَجَنَّۃٌاَبَدًا اَوْلَنَارٌ اَبَدًا))(نہج البلاغۃ)

"(اے میرے قبیلے کے لوگو!) قافلے کا رہبر قافلے والوں سے جھوٹ نہیں بولا کرتا' قسم بخدا اگر میں تمام انسانوں سے بھی جھوٹ بول سکتا تب بھی تم سے جھوٹ نہ بولتا اور اگر تمام انسانوں کو دھوکہ دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی دھوکہ نہ دیتا۔ اس اللہ کی قسم جس کے علاوہ کوئی حقیقی خدا نہیں ہے' قسم بخدا' تم سب پر موت وارد ہوگی جس طرح تم رات کو سو جاتے ہو' پھر تمہیں اٹھایا جائے گا جس طرح تم صبح کو بیدار ہوتے ہو' جو کچھ تم کر رہے ہو اس کا تم سے حساب لیا جائے گا' پھر تمہیں ضرور بدلہ مل کر رہے گا' بھلے کام کا اچھے بدلے کے ساتھ اور برُے کام کا برُے بدلے کی شکل میں' نتیجتاً یا تو ہمیشہ ہمیش کے لئے جنت ہوگی اور یا مستقل آگ کا ٹھکانہ ہوگا"۔

معلوم ہوا کہ اصل زندگی وہ نہیں جو ہم یہاں گزار رہے ہیں' بلکہ اصلی اور ابدی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ زندگی کی حقیقت اور تسلسل سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ : ایک وہ زندگی تھی جو ہم یہاں اس دنیا میں آنے سے پہلے گزار چکے ہیں' اس وقت ہم صرف عالم امر کی شے تھے' عالم خلق میں ہمارا کوئی وجود نہیں تھا' بس ارواح تھیں جنہیں پیدا کرکے سوال کیا گیا :

﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوْا بَلٰی ۚ ﴾ (الاعراف : ۱۷۲)

"کیا میں تم سب کا رب (خالق + مالک + پروردگار) نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا : ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں"۔

پھر ارواح انسانیہ کو سلا دیا گیا یا یوں کہئے کولڈ سٹوریج میں رکھ دیا گیا۔ اور پھر جیسے جیسے عالم خلق میں رحم مادر کے اندر کوئی ہیولا تیار ہوتا ہے اس انسان کی روح لاکر اس جسم میں شامل کردی جاتی ہے۔ یہ بہت اونچے اور نازک حقائق ہیں۔ بقول شاعر ؎

تو اسے پیمانہ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں' پیہم دواں' ہر دم جواں ہے زندگی

اور

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ﴾

(الملك : ۲)

"اس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔

اور یہی عرصہ یعنی دنیاوی زندگی ہمارا دار الامتحان ہے اور یہ گویا ہماری زندگی کی دوسری منزل ہے۔ اگلی منزل عالم برزخ ہے۔ اس کے بعد بعث و نشور کا مرحلہ ہے اور آخرت میں جنت یا دوزخ۔ یہ سب کے سب مراحل ہمارے ایمان کا جزو لازم ہیں۔ اور ان کا مجموعی نام "ایمان بالآخرت" ہے!

تیسرا اہم سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسان کی جوابدہی کی بنیاد کیا ہے؟

اسے اس وقفہ امتحان میں کیا کچھ دیا گیا ہے کہ جس کا حساب لیا جائے گا؟ کیا پڑھایا گیا ہے جس کا امتحان ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر انسان accountable (قابل محاسبہ) اور responsible (ذمہ دار) ہے' ان استعدادات اور صلاحیتوں کی وجہ سے جو فطری طور پر اس میں رکھی گئی ہیں :

۱۔ سمع و بصر کی صلاحیت :

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ (الدھر : ۲)

"ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لئے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔"

۲۔ عقل و شعور:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی۔ یہ بھی محاسبہ کی ایک بنیاد ہے۔ فرمایا:

﴿ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴾

(بنی اسرائیل: ۳۶)

"یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کے بارے میں بازپرس ہوگی۔"

متکلمین کے نزدیک اہم ترین شے عقل ہے اور اسی کی بنیاد پر انسان اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہوگا۔ جب اس نے تمہیں عقل جیسی نعمت سے نوازا ہے تو اس منعم ذات کو اس سے پہچانو۔ جب دھوئیں کو دیکھ کر پہچان لیتے ہو کہ آگ لگی ہوئی ہے تو اتنی بڑی کائنات کو دیکھ کر خالق کو نہیں پہچان سکتے؟

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتر است معرفت کردگار

انسان آنکھیں ہی بند کرنے پر مصر ہو جائے تو دوسری بات ہے ورنہ

﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۚ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ﴾

(بنی اسرائیل: ۴۴)

"اس کی تسبیح تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں کر رہی ہیں جو آسمان و زمین میں ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔"

۳۔ نیکی اور بدی کی پہچان:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ﴾

(الشمس: ۷، ۸)

یہ علم وحی اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ اور چنے ہوئے بندوں پر نازل فرمایا' جو سیرت و کردار اور اخلاق کے اعلیٰ نمونے تھے گویا کہ نوعِ انسانی کا عطر تھے۔ اسی لئے فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (آل عمران : ۳۳)

"اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (اپنی رسالت کے لئے) منتخب کیا تھا۔"

اور اس وحی کے ذریعے ہدایت و شریعت سے متعلق ہر چیز کی تفصیلات بیان کر دیں کہ یہ کرو' یہ نہ کرو' یہ راستہ ہلاکت کو جانے والا ہے اور یہ راستہ جنت کی طرف جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ہلاکت کا راستہ بظاہر بڑا خوشنما ہوتا ہے لیکن انجام کے اعتبار سے بڑا بھیانک' جبکہ دوسری طرف جنت کی راہ اپنانے میں مشکل ہی مشکل نظر آتی ہے لیکن یہی درحقیقت دنیا میں امن اور آخرت میں نجات کا راستہ ہے۔

ان حقائق کو بیان کرنے بلکہ روز روشن کی طرح واضح کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انزالِ وحی' بعثت انبیاء و رُسل اور ارسالِ کتب و شریعت کا اہتمام کیا اور اس طرح انسان پر "اتمامِ حجت" کر دیا' اگرچہ حجت تو پہلے ہی عقل' سمع و بصر' نیکی و بدی کے شعور' معرفت رب اور محبت خداوندی کے ذریعے پوری کی جا چکی تھی۔

رسالت کی کڑیاں

اللہ تعالیٰ اور چنے ہوئے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء و رُسل کے درمیان رابطے کا ذریعہ (link) حضرت جبریل علیہ السلام رہے ہیں' جو فرشتوں کے سردار ہیں۔ انبیاء و رُسل علیہم السلام بھی اپنے اپنے وقت میں اپنی قوم کے سربراہ اور اللہ تعالیٰ کے منتخب بندے ہوتے ہیں۔ اس طرح ایمان بالملائکہ بھی ایمان بالرسالت کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ ﴾

(الحج : ۷۵)

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لئے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔"

فرشتوں میں سے جبریل علیہ السلام نے وحی کو اللہ تعالیٰ سے وصول کیا اور اپنے اپنے وقت کے رسول تک پہنچایا' اور سب سے آخر میں انہوں نے وحی کو رسول اکرم ﷺ تک پہنچایا۔ چونکہ جبریل فرشتے ہیں اور نوری الاصل ہیں' اس لئے وہ اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہیں۔ اور سارے کے سارے انبیاء و رُسل علیہم السلام بشر ہیں' للذا انہیں عالم انسانی سے قرب حاصل ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اور نوع انسانی کے مابین ایک فرستادہ فرشتہ (رسولِ ملک) اور ایک فرستادہ انسان (رسولِ بشر) رابطے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس طرح یہ رابطہ (link) مکمل ہو گیا' اب یہ قوم کے پاس آنے والے نبی اور رسول کی ذمہ داری ہے کہ وہ زبان سے بھی تبلیغ کریں اور کردار سے بھی۔ یعنی جو تعلیم ان تک پہنچی ہے وہ اس کا عملی نمونہ بھی پیش کریں۔ ان کی طرف جو ہدایت ربّ العالمین کی طرف سے پہنچی ہے اس کا نمونہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پیش کریں تاکہ انسانیت پر "اتمامِ حجت" ہو جائے۔

واضح رہے کہ بنیادی حجت نبوت و رسالت نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر حجت تو وہ پانچ چیزیں ہیں جن کا تفصیلی ذکر ابھی گزرا ہے۔ البتہ یہ سلسلہ نبوت و رسالت "اتمام حجت" ضرور ہے۔ اور یہ سلسلہ وحی نبوت و رسالت اور آسمانی کتب پر مشتمل ہے جس کی تکمیل محمد رسول اللہ ﷺ پر ہو جاتی ہے۔ ان امور کو ایک لڑی میں پرو دیں تو یہ "ایمان بالرسالت" بن جاتا ہے۔

حاصل بحث

ایمان کا موضوع ہے : مابعد الطبیعیات کے مسائل۔ ان مسائل کے جو جوابات حکماء اور فلاسفہ نے پیش کئے اس کا نام فلسفہ ہے۔ اور جو حل انبیاء و رُسل نے بذریعہ وحی بیان کیا وہ "ایمان" ہے۔ انبیاء و رُسل نے جو کچھ بیان فرمایا ان کی ایک ظاہری سطح ہے جو قرآن و حدیث میں واضح الفاظ میں ملے گی' یعنی عام آدمی کے لئے موٹے موٹے

مسائل' کہ یہ حلال ہے' یہ حرام ہے' یہ کرنا ہے اور اس سے باز رہنا ہے۔ ان کی مثال یوں سمجھ لیں کہ سمندر کے اندر تیرنے والے بہت بڑے برفانی تودے (iceberg) کی ہے کہ سطحِ سمندر پر سے اس کا صرف چوٹی کا سرا (tip) نظر آتا ہے۔ چنانچہ عام فہم چیزیں وہی ہیں جو سب کو نظر آ رہی ہیں' لیکن یہ ایمان کی tips ہیں۔ "اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَ مَلاَئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ"[11] یہ باتیں ہیں جنہیں ماننے کا نام ایمان ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ آئس برگ کے tip کی مانند ہر ہر نقطے کے نیچے کیسے کیسے خزانے ہیں' اس کی حکمت' فلسفہ' دلائل' حقیقت اور گہرائیاں' ان تک پہنچنا نہ ہر کسی کے لئے ممکن ہے اور نہ ہی لازم' قرآن حکیم کی تمثیل کی زبان میں بس یوں سمجھ لیں :

﴿ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ○ ﴾ (الانشقاق : ١٩)

جیسے جیسے گہرائی میں اتریں گے حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی۔ وہاں ہر شخص کے ذہن کی رسائی حسب تناسب (proportionally) ہو گی۔ اگر کوئی اس میدان میں ایک قدم گیا تو کوئی دوسرا سو قدم بھی جا سکتا ہے اور کسی کی رسائی ہزار یا لاکھ قدم تک بھی ہو سکتی ہے۔ ویسے تو ایمان کی بحث کے بعض اہم گوشوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی بالکل ابتداء ہی میں بیان کر دیا ہے۔ فرمایا :

﴿ الٓمّٓ ○ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لاَ رَیْبَ فِیْہِ ۚ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ○ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ○ ﴾ (البقرۃ: ١ ـ ٤)

---

(١١) حدیث جبریل کے نام سے کتب حدیث میں جو الفاظ آتے ہیں ان سب کو ایک جامع عبارت کی شکل میں ترتیب دے دیا گیا ہے' ملاحظہ ہو : صحیح البخاری:٥٠' کتاب الایمان' باب سوال جبریل ١/١٤٠' مع الفتح و صحیح مسلم:١ـ٧' کتاب الایمان باب ١ تک مسلسل دیکھ لیں۔

"الف' لام' میم' یہ الکتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں' ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں"۔

نیز سورۃ البقرۃ کے آخر میں بھی ایمان کا ذکر بھرپور انداز میں آیا ہے :

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ ﴾ (البقرۃ : ۲۸۵)

"رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسول کو ماننے والے ہیں انہوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کرلیا ہے۔ یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں"۔

سورۃ البقرۃ کے شروع میں اور اختتام میں جو تعبیر ہے اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ سورۃ البقرۃ میں اہل کتاب سے خطاب ہو رہا ہے' اس حوالے سے جو باتیں اہم تر تھیں انہیں نمایاں کردیا گیا۔ آیہ بِر سورۃ البقرۃ کے بالکل وسط میں ہے۔ اس میں ایمان کی اضافی تفصیل بالکل سادہ تعبیر کے ساتھ بیان کردی گئی ہے۔ فرمایا :

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ ﴾

(البقرۃ : ۱۷۷)

"نیکی یہی نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف' بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخرت اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے"۔

اس آیت میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے علاوہ ملائکہ' کتب اور انبیاء و رُسل پر ایمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان تینوں کو جمع کرلیں تو یہ ایمان بالرسالت بنتا ہے' کیونکہ

اس کی بنیاد وحی ہے جسے لانے والے فرشتے ہیں۔ کتابیں اس وحی کا ریکارڈ ہیں اور جن پر وحی نازل ہوئی وہ نبی و رسول کہلاتے ہیں۔ یہ ایمان کا سادہ اور واضح خاکہ ہے' لیکن یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ سارا ایمان اس میں جمع ہے' بلکہ قرآن حکیم میں حکمت و فلسفہ سے بھرپور سارے حقائق موجود ہیں' بس غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ایمان باللہ کی مثال کو سامنے رکھیں۔ اس ضمن میں سورۃ الحدید میں یہ آیت موجود ہے : ﴿ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ﴾ وہی اوّل یعنی جس سے پہلے کوئی ذات نہیں' وہی آخر جس کے بعد کوئی نہیں' وہی ظاہر جس سے زیادہ واضح اور نمایاں کوئی نہیں' وہی باطن جس سے زیادہ لطیف اور پوشیدہ کوئی نہیں۔ گویا وجودِ حقیقی صرف اسی ذات کا ہے۔

ایمانیاتِ ثلاثہ کا باہمی ربط

ایمانیاتِ ثلاثہ میں باہم ایک نسبت و تناسب موجود ہے جس کی تفصیل کچھ یوں ہے :

ایمان باللّٰہ : اصولی' نظری' علمی اور فکری اعتبار سے اصل ایمان صرف "ایمان باللہ" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان مجمل کے الفاظ ہیں : "آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ" تو معلوم ہوا کہ ایمان مجمل نام ہے "ایمان باللہ" کا' اسی کی گہرائی کو معرفت کہتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات' اس کے اسماء اور صفات کو پہچان لینا اور مان لینا جیسا کہ پہچاننے اور ماننے کا حق ہے۔

ایمان بالآخرہ : یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت عدل و قسط کا عملی ظہور ہے۔ یعنی وہ عادل ہے' انصاف کرے گا' نیک لوگوں کو جزا اور بدکاروں کو سزا دے گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا عملی ظہور آخرت میں ہو گا۔

ایمان بالرسالت : یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہدایت کی توسیع (extension)

ہے۔ ہدایت کا ایک حصّہ تو وہ ہے جو اس نے علوم طبیعیہ کی صورت میں دے کر ہمیں اس دنیا میں بھیجا اور ہدایت کا دوسرا حصّہ وہ ہے جو اس نے بذریعہ وحی نازل فرمایا۔ کیونکہ وہی "ہادی" ہے۔ علوم طبیعیہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ﴾ (البقرہ : ۳۱)

"اور اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے"۔

اس کے بعد ہدایت رحمانی کا ثمرہ وفائدہ ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

﴿ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○ ﴾ (البقرة : ۳۸)

"پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔"

خلاصۂ کلام

زوالِ خوف وحزن کا نام امن ہے اور امن کا ذریعہ ایمان ہے۔ اسی لئے نیا چاند نظر آنے پر حضور اکرم ﷺ بالالتزام یہ دعا مانگا کرتے تھے۔ "اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ"[۱۲] یعنی "اے اللہ تو اس نئے چاند کو ہم پر امن اور ایمان کے ساتھ اور سلامتی اور اسلام کے ساتھ طلوع فرما!" تو معلوم ہوا کہ امن کا تعلق ایمان سے ہے اور سلامتی کا تعلق اسلام سے ہے۔ نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اصل ایمان ایمان باللہ ہے 'بقیہ دونوں ایمان اس کی شاخیں اور فروع (corollaries) ہیں۔ ایمان بالاخرۃ اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا ظہور ہے اور

---

۱۲) المستدرك للحاكم ۲۸۵/۴ و سنن الدارمی ۴/۲ کتاب الصوم باب ۳' وکتاب السنة لابن ابی عاصم' ح ۳۷۶۔ البتہ باقی محدثین نے مذکورہ بالا الفاظ کی بجائے "بِالْيُمْنِ وَالْاِيْمَانِ" کے لفظ بیان کئے ہیں' ملاحظہ ہو : سنن الترمذی:۳۴۵۱' کتاب الدعوات' مسند احمد ۱۶۲/۱ ومسند ابی یعلی ۲۵/۲' ح ۶۶۱ و ۶۶۳۔

ایمان بالرسالت صفت ہدایت کی توسیع۔ البتہ علمی اور اخلاقی اعتبار سے اصل ایمان ایمان بالآخرۃ ہے' کیونکہ اگر آخرت اور اس میں پیش آنے والے مراحل پر یقین نہیں ہوگا تو ایمان باللہ محض ذات و صفات کی بحثیں بن کر رہ جائے گا۔ علامہ اقبال نے خوب کہا ہے ؎

اہل مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کم تر نہیں علم الکلام

مجرد علم الکلام تو ایک ذہنی ورزش اور فکری عیاشی بن کر رہ جاتا ہے۔ محض ذات و صفات کی بحثیں آپ کے کردار پر کوئی مثبت اثر مرتب نہیں کرتیں جب تک کہ آخرت میں پکڑ کا شدید احساس اور یقین نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰىۤ ۝ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝ ﴾ (العلق : ٦ - ٨)

"ہرگز نہیں' انسان سرکشی کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔ حالانکہ پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔"

اس لئے کہ دنیاوی زندگی میں فی الفور نتائج اعمال کا کوئی انتظام نہیں' مثلاً میں نے جھوٹ بولا تو زبان پر چھالا بھی نہیں نکلا' اس کے بالمقابل گرم چائے سے زبان پر فوراً چھالا ہو جاتا ہے' جبکہ حرام کھانے سے پیٹ میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ انسان دیکھ رہا ہے کہ اخلاقی قوانین اس عالم میں نافذ العمل (operative) نہیں ہیں جبکہ طبعی قوانین (Physical Laws) فوراً اثر دکھاتے ہیں۔ لہٰذا انسان بے دھڑک ظلم' سرکشی' تعدی اور حرام خوری کرتا ہے۔ اگر اسے کوئی چیز روک سکتی ہے تو وہ ﴿ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ﴾ کا یقین ہے۔ اگر یہ یقین دل میں سما گیا اور آخرت اور حساب و کتاب پر ایمان پختہ ہو گیا تو باہر سے کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو اندر سے ہی ایمان کا چوکیدار' خبردار کرنے والا اور روکنے والا پیدا ہو جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ اصلاح عمل کے لئے اصل مقام ایمان بالآخرت کا ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے

اس طرح بیان فرمایا ہے :

﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِىْ لِلَّتِىْ هِىَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ○ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ○ ﴾ (بنی اسرائیل : ۹،۱۰)

”حقیقت یہ ہے کہ یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے' جو لوگ اسے مان کر بھلے کام کرنے لگیں انہیں یہ بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت کو نہ مانیں انہیں یہ خبر دیتا ہے کہ ان کے لئے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے۔“

آیت کریمہ پر ذرا غور کریں کہ پہلے حصے میں ایمان اور عمل صالح کے بعد اجر کبیر کا ذکر کیا گیا اور دوسرے حصے میں آخرت کے انکار کے نتیجے میں عذاب الیم کا بیان ہو گیا' کیونکہ جب آخرت کا انکار ہو گیا تو بد اعمالیاں از خود آجائیں گی' ان کے بیان کی ضرورت ہی نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عملی اعتبار سے اہم ترین ایمان' ایمان بالآخرۃ یا ایمان بالمعاد ہے۔

البتہ شرعی اور فقہی اعتبار سے اصل ایمان ”ایمان بالرسالت“ ہے۔ مثلاً ایک آدمی مکمل موحد ہے' بظاہر نیک ہے' لیکن رسول کا انکار کرتا ہے تو وہ کافر ہے' خواہ اس کا حسب ونسب اور معاشرتی مقام کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ دنیا میں مسلمان اور کافر کی پہچان ایمان بالرسالت سے ہوگی۔ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد سب سے بڑا دستوری مسئلہ یہ ہوگا کہ کون مسلمان ہے اور کسے کافر قرار دیں؟ یہاں کا مکمل شہری (citizen) کون ہے؟ مکمل شہریت کے حقوق کس کو حاصل ہیں؟ تو اس اعتبار سے اہم ترین ایمان' ایمان بالرسالت ہے۔

معلومات مذکورہ کو سامنے رکھیں گے تو تینوں ایمانیات کا باہم ربط اور تینوں کے درمیان نسبت و تناسب سمجھ میں آجائے گا۔

ایمان بالرسالت کا خصوصی مقام

جیسا کہ ہم نے بیان کیا شرعی اور فقہی اعتبار سے اصل ایمان' ایمان بالرسالت

ہے۔ اگر کوئی شخص موحد کامل ہو' کردار کے اعتبار سے اونچے مقام پر ہو لیکن رسول کو نہ مانے تو وہ کافر ہے۔ اس کی ساری توحید اور اخلاق و کردار کی ایمان کے اعتبار سے کوئی قدر و قیمت نہیں جب تک کہ وہ رسول کو نہ مان لے۔ تو معلوم ہوا کہ ایمان بالرسالت کی شرعی' فقہی اور قانونی حیثیت اتنی زیادہ ہے کہ ایک اعتبار سے ایمان بالرسالت' ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ پر بھی حاکم ہے۔ کیونکہ ایمان باللہ بھی صرف وہی معتبر ہوگا جو ان اسماء و صفات کے ساتھ ہو جن کی خبر ہمیں رسول اللہ ﷺ سے ملی ہے۔ اپنے طور پر کسی وجودِ مطلق' Universal Spirit' رُوحِ کائنات' یا واجب الوجود کو مان لینا اللہ تعالیٰ پر ایمان شمار نہیں ہوگا جب تک کہ یہ ایمان "آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَ صِفَاتِہٖ" (میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کے اسماء و صفات سمیت ایمان لایا) کی کیفیت کا حامل نہ ہو۔ اور یہ اسماء و صفات ہمیں یا تو قرآن حکیم سے ملے ہیں جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ملا ہے یا پھر سُنّت مطہرہ سے معلوم ہوئے ہیں۔ بہرحال ہمیں ایمان باللہ کے باب میں جو بھی معلومات حاصل ہوئیں ایمان بالرسالت کے حوالے سے ملیں۔ چنانچہ محض کسی کو خالق مان لینا "ایمان باللہ" شمار نہیں ہوگا۔ اسی طرح محض کسی کو رُوحِ کائنات مان لینا بھی ایمان باللہ شمار نہیں ہوگا جب تک کہ اس ہستی کے لئے وہ اسماء و صفات نہ تسلیم کئے جائیں جن کا علم ہمیں رسالت کے واسطے سے ہوا ہے۔

اسی اصول کے مطابق ایمان بالآخرۃ بھی صرف وہی معتبر ہوگا جو ان تمام تفصیلات کے ساتھ ہو جن کی خبر ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ نے فراہم کی ہے۔ محض مجازات' قانونِ مجازات اور انسانی وجود و حیات کا کوئی تسلسل مان لینا ایمان بالآخرت نہیں کہلا سکتا۔ موت' رُوح کی پرواز' قبر' حسابِ قبر' قبر کی نعمتیں یا سزائیں' بعث بعد الموت' حشر و نشر' حاضری محشر' شفاعت کبریٰ' وزنِ اعمال' جزاء و سزا' حساب کتاب' پل صراط' جنت اور دوزخ' جنت کی نعمتیں یا دوزخ کی سزائیں اور عقوبتیں' یہ تمام چیزیں جو پوری تفصیلات کے ساتھ ہمیں احادیث نبویہ [۱۳] سے

ملی ہیں ان کو دل کی گہرائی سے مانا جائے تب دینی اور شرعی اعتبار سے یہ ایمان بالآخرت کہلائے گا' ورنہ مجرد رُوح انسانی کے تسلسل یا وجود انسانی کی بقاء کو اگر کوئی مانتا بھی ہے تو یہ ایمان بالآخرۃ نہیں ہے۔

---

۱۴) تفصیل اور دلیل کے ساتھ ان چیزوں کا مطالعہ کرنا ہو تو الاستاذ عبدالملک الکلیب کی عربی تالیف اھوال القیامۃ کا مطالعہ از حد مفید ہے جسے ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ ترجمہ نہایت آسان اور سلیس ہے۔ نیز احادیث کی محدثانہ انداز میں تحقیق و تخریج بھی کر دی گئی ہے۔

بابِ چہارم

قانونی اور حقیقی ایمان کا فرق
اور ان کے ضمن میں کلامی مباحث

ایمان کے مراتب

ایمان کے مراتب بہت زیادہ ہیں' اس لئے کہ ایمان کی intensity یعنی ایمان کی قوت یا شدت جسے ہم علم الیقین' عین الیقین اور حق الیقین سے تعبیر کرتے ہیں' یہی ایمان کے مراتب ہیں۔ ایمان کی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے بھی بے شمار مراتب ہیں' مثلاً ایک عام دیہاتی کے ایمان اور ایک عالم' دانا اور حکیم انسان کے ایمان میں زمین و آسمان کا فرق ہو گا۔ اسی طرح کسی صحابیِ رسول کے ایمان کے مقابلہ میں عام مسلمان بلکہ کسی کامل ولی کے ایمان میں بھی بہت نمایاں فرق ہو گا ع گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی! خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ایک طرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایمان اور دوسری طرف کسی عام صحابی کے ایمان میں' ظاہر بات ہے' زمین و آسمان کا فرق ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ میدان حشر میں اہل ایمان کو جو نور عطا ہو گا اس کے درجات مختلف ہوں گے۔[1] یہ مضمون سورۃ الحدید اور سورۃ التحریم میں دو جگہ بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

---

(۱) علامہ جلال الدین السیوطی اپنی معروف تفسیر الدر المنثور ۵۲/۸ ط دار الفکر بیروت میں سورۃ الحدید آیت ۱۲ کی تفسیر میں یہ حدیث لائے ہیں :

عن قتادة رضی اللّٰہ عنہ ان نبی اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم قال : ((ان من المومنین یوم القیامة من یضیء لہ نورہ کما بین المدینة الی عدن ابین الی صنعاء فدون ذلك حتی ان من المومنین من لایضیء لہ نورہ الا موضع قدمیہ (باقی اگلے صفحہ پر)

﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾

"ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں طرف دوڑ رہا ہو گا۔"

اسی آیت کی تشریح میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اہل ایمان میں سے کسی کو اتنا نور عطا ہو گا کہ روشنی مدینہ منورہ سے صنعاء تک پہنچے گی (صنعاء یمن کا ایک شہر ہے' فی زمانہ بھی ہم کسی ایسی روشنی کا تصور نہیں کر سکتے کہ انسان کی بنائی ہوئی کوئی روشنی اتنی دور تک پہنچ سکے' سورج یا چاند کی روشنی کی بات اور ہے) اور کسی کے پاس صرف اس قدر نور ہو گا کہ قدموں کے آگے روشنی ہو جائے جیسا کہ ٹارچ کی روشنی ہوتی ہے۔ جسے اتنی روشنی مل جائے وہ بھی بڑا خوش نصیب ہو گا۔ اس لئے کہ وہ پل صراط سے تو گزر جائے گا' ٹھوکریں کھا کر گرے گا تو نہیں۔ بہرحال میدان حشر میں ملنے والے نور کی قوت و طاقت ایمان حقیقی کے اعتبار سے ہو گی' جیسا ایمان ہو گا ویسا ہی نور ہو گا اور ان کے درمیان مختلف درجات و مراتب ہوں گے۔

ایمان کے دو رُخ

ایمان کے ان دونوں رُخوں یا پہلوؤں کو سمجھنے کیلئے چند اصولی باتیں سمجھ لیجئے :

(۱) ظاہری ایمان —— بمقابلہ —— باطنی ایمان

(۲) قانونی ایمان —— بمقابلہ —— حقیقی ایمان

(۳) لسانی ایمان —— بمقابلہ —— قلبی ایمان

(گزشتہ سے پیوستہ) والناس نازل باعمالھم)) (بحوالہ مصنف عبدالرزاق و عبد بن حمید و ابن المنذر) (و بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما المستدرک ۴۷۸/۲)

حضرت قتادۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : "قیامت کے روز اہل ایمان میں سے کسی کا نور تو مدینہ منورہ سے لے کر عدن تک صنعاء سے بھی آگے تک روشنی کر رہا ہو گا اور کسی کا اس سے کم ہو گا' حتیٰ کہ بعض اہل ایمان کا نور ان کے قدموں کی جگہ تک ہی روشنی کرے گا اور لوگ اپنے اپنے اعمال کے اعتبار سے مختلف درجات پر ہوں گے"۔ (اضافہ از مرتب غفرلہ)

(۴) دنیا میں معتبر ایمان ــــــ بمقابلہ ــــــ آخرت میں معتبر ایمان

ایمان کو سمجھنے کے لئے ہمیں مذکورہ بالا امور پر مختلف زاویوں سے غور کرنا ہے۔ ایمان مجمل کے الفاظ پر ذرا غور کریں۔ فرمایا گیا : "آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَ صِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ"۔ معلوم ہوا کہ اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب ایمان کے دو رُخ ہیں۔ ان دونوں میں سے سب سے اہم جس پر ساری بحث کا دار و مدار ہے وہ ہے تصدیق بالقلب' یہ خفیہ اور باطنی چیز ہے اور دل کی کیفیت ہے۔ اس کی صحیح تحقیق دنیا میں نہیں ہو سکتی' ہمارے پاس اس کی Verification' توثیق یا تردید اور اثبات یا نفی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ فلاں شخص کے دل میں ایمان ہے یا نہیں ہے' اس لئے کہ ہماری رسائی وہاں تک ہو ہی نہیں سکتی۔ آخرت میں اس ذات سے سابقہ پیش آئے گا جو "عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ" ہے' یعنی جو دل کی اتھاہ گہرائیوں میں پلنے والی سوچ کو بھی جانتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَیَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ط وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○﴾ (التغابن : ۴)

"وہ آسمان و زمین کی ہر ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور جو کچھ تم چھپاؤ اور جو ظاہر کرو وہ سب کو جانتا ہے' اللہ تو دل کی باتوں تک کو جانتا ہے۔"

لہٰذا آخرت میں حساب کا سارا دار و مدار تصدیق بالقلب پر ہو گا۔ فرض کریں ایک شخص دنیا میں مسلمانوں کا قائد بنا ہوا ہے' اگر وہ آخرت میں تصدیق بالقلب سے خالی پہنچا تو اس کا دعوائے ایمان کسی کام کا نہ ہو گا۔ البتہ دنیا میں تصدیق بالقلب تحقیق و تفتیش کا موضوع نہیں بن سکتا' اس لئے کہ اس کو ہم Verify کر ہی نہیں سکتے' اس کے بارے میں اثبات یا نفی کا حکم لگا ہی نہیں سکتے۔ لہٰذا اس دنیا میں جس بنیاد پر کسی کے ایمان کا فیصلہ یا معرفت ہو گی وہ زبان کا قول و اقرار ہے۔ دنیا کے اندر یہی فیصلہ کن ہو گا۔

حقیقت ایمان سمجھنے میں چند اشکال اور ان کی وضاحت

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ ﴾ (النساء : ۹۴)

"اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں جا رہے ہو (جہاد کے لئے نکلو) تو تحقیق کر لیا کرو اور جو تم سے "السلام علیکم"[۲] کہے تم اسے یہ نہ کہہ دو کہ تو ایمان والا نہیں۔ تم دُنیوی زندگی کے اسباب کی تلاش میں ہو تو اللہ کے پاس بہت سی غنیمتیں ہیں"۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں صرف سلام کرنے والے یا اطاعت پیش کرنے والے کو مؤمن تسلیم کر کے اسے پورے حقوق دے دیئے۔ دوسری طرف اہل ایمان کی پہچان ان الفاظ میں بیان کی، فرمایا :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾ (الحُجُرات : ۱۵)

---

(۲) ﴿اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ﴾ کے دو ترجمے کیے گئے ہیں، یعنی تمہیں سلام کرے یا تمہارے سامنے اطاعت پیش کرے اور لفظی معنی ہے سلام کرے یا السلام علیکم کہے۔ یہ بھی گویا کہ اظہارِ اسلام کا ذریعہ تھا کہ میں بھی مسلمان ہوں —— مولانا تھانویؒ نے ترجمہ کیا ہے "جو اطاعت ظاہر کرے"۔ حضرت شیخ الہند مولانا سید محمود حسن شاہ صاحبؒ نے ترجمہ کیا ہے "جو سلام کرے" اور اسی ترجمہ کو مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اختیار کیا ہے۔ میرے خیال میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کا اختیار کردہ ترجمہ "جو اطاعت ظاہر کرے" زیادہ بہتر ہے۔ "تم اسے مت کہو کہ تم مؤمن نہیں ہو"۔ اصول یہ طے پایا کہ اگر اسے مسلمان مان لیا تو اس کی جان و مال دونوں محفوظ اور اگر سلام کرنے والے کو مسلمان تسلیم نہ کیا جائے تو اسے قتل کیا جا سکتا ہے اور اس کا مال مالِ غنیمت شمار کیا جا سکتا ہے۔ (ماخوذ)

"مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائیں اللہ پر اور اس کے رسول پر' پھر ہرگز شک نہ کریں' اور جہاد کریں اللہ کی راہ میں اپنی جانوں کو کھپا کر اور مال لگا کر' صرف یہی لوگ (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔"

سورۃ الحجرات کی اس آیت میں ایمان کے دو لازمی نتائج بیان کئے گئے ہیں' یعنی باطنی طور پر دل میں یقین کی کیفیت اور ظاہری طور عمل میں جہاد کا مظاہرہ۔ انہی دونوں نتائج کو مزید تفصیل سے سورۃ الانفال کی آیات ۲ تا ۴ میں ان الفاظ کے ساتھ بیان فرمایا:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ○ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ○ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ○ ﴾

"مؤمن تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ہو تو ان کے دل کانپ جائیں' جب اس کی آیات پڑھ کر سنائی جائیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہو اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہوں۔ جو نماز قائم کرتے ہوں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہوں۔ یہ ہیں سچے مؤمن' ان کے لئے ان کے رب کے پاس درجات بھی ہیں اور بخشش بھی اور رزق کریم بھی ہے"۔

ان آیات کو سورۃ الانفال ہی کی آیت ۷۴ کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو بات مزید واضح ہو جاتی ہے ـــــ فرمایا:

﴿ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ○ ﴾

"وہ لوگ جو ایمان لائے' جنہوں نے ہجرت کی' جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا' اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد کی (مہاجرین اور انصار) یہی ہیں سچے مؤمن' ان کے لئے خطاؤں سے درگزر و مغفرت ہے اور بہترین رزق"۔

اب غور کیجئے' ایک طرف قرآن کہہ رہا ہے کہ جو تمہیں سلام کرے یا صرف اطاعت ظاہر کرے تم اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم مؤمن نہیں ہو (النساء : ۹۴) اور دوسری طرف قرآن مجید نے قبولیت ایمان کے لئے اتنی عظیم اور بھاری بھرکم تفصیلات جاری کردی ہیں (سورۃ الحجرات آیت ۱۵اور سورۃ الانفال آیات ۲'۳'۴ اور ۷۴)۔ اس اشکال کو حل کرنے سے پہلے حدیث رسول اللہ ﷺ میں موجود "ظاہری تضاد" کو بھی سامنے رکھ لیں۔ ایک طرف آپ ﷺ نے فرمایا : ((مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مُخْلِصًا دَخَلَ الْجَنَّةَ))[۳] "جس کسی نے اخلاص کے ساتھ لآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا"۔ اس حدیث میں تو پھر بھی امکان ہے کہ کچھ سزا جھیل کر یا کچھ وقت جہنم میں گزار کر پھر جنت میں چلا جائے' لیکن ایک دوسری حدیث جسے حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں' کے الفاظ ہیں :

سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ : ((مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ))[۴]

"میں نے رسول اللہ ﷺ کو یوں فرماتے سنا : جو آدمی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دے اللہ نے اس پر آگ کو حرام کردیا"۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس پر آگ حرام ہے' لہٰذا جہنم میں جانے کا سوال ہی نہیں۔ اس سے ایک قدم اور آگے جاتے ہیں۔ ایک حدیث میں بڑے بڑے گناہوں کا بھی تذکرہ ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ :

---

(۳) کشف الاستار ۱۱/۱' و مسند احمد ۲۳۶/۵۔ علامہ الالبانی نے حدیث کو صحیح کہا ہے' ملاحظہ ہو سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ ح ۲۳۵۵۔

(۴) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی من مات علی التوحید دخل الجنہ قطعًا ح ۲۹۔ و مسند احمد ۳۱۸/۵۔ و سنن الترمذی' کتاب الایمان' باب ماجاء فیمن یموت..... ح ۲۶۳۸ اور دیگر صحابہ کرام سے بھی یہ روایت موجود ہے' ملاحظہ ہو مسند احمد ۱۳۵/۳ و ۴۵۱۔ ۴۰۲/۴۔ ۲۳۶/۵۔

اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَيْهِ ثَوْبٌ اَبْيَضُ وَهُوَ نَائِمٌ ثُمَّ اَتَيْتُهُ وَقَدِ اسْتَيْقَظَ فَقَالَ : ((مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰى ذٰلِكَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ)) قُلْتُ : وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ؟ قَالَ : ((وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ)) قُلْتُ : وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ؟ قَالَ : ((وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ)) قُلْتُ : وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ؟ قَالَ : ((وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ عَلٰى رَغْمِ اَنْفِ اَبِي ذَرٍّ))[(۵)]

"میں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ سفید کپڑا اوڑھے سو رہے تھے۔ دوبارہ حاضر ہوا تو آپ بیدار ہو چکے تھے۔ اس موقع پر آپ ؐ نے فرمایا : "جس بندے نے بھی لا الٰہ الا اللہ کہا پھر وہ اسی پر مرگیا وہ جنت میں داخل ہو گیا"۔ میں نے دریافت کیا : خواہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ آپ ؐ نے فرمایا : "خواہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو"۔ میں نے دوسری دفعہ دریافت کیا : خواہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ آپ ؐ نے فرمایا: خواہ

---

(۵) صحیح البخاری' کتاب اللباس' باب الثیاب البیض' ح ۵۴۸۹۔ نیز متعدد مقامات پر۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب من مات لایشرك باللہ شیئا دخل الجنة... ح ۹۴۔ وسنن الترمذی' کتاب الایمان' باب ماجاء فی افتراق ھذہ الامة ح ۲۶۴۴۔ ومسند احمد ۱۶۶/۵۔ و صحیح ابن حبان ۳۹۲/۱ کتاب الایمان' باب فرض الایمان ح ۱۶۹ و ۱۷۰ و ۱۹۵ و ۲۱۳۔ ومسند ابوداؤد الطیالسی ح ۴۴۴ و شرح السنة للبغوی ۹۹/۱ باب من مات لایشرك باللہ شیئا ح ۵۴ و کتاب الایمان لابن مندہ ح ۸۴ و ۸۵ و ۸۶ و مسند ابی عوانہ ۱۹/۱۔ حدیث کی اہمیت کی وجہ سے سارے دستیاب حوالے ذکر دیئے ہیں ورنہ صرف بخاری و مسلم کا حوالہ بھی کفایت کرجاتا (مرتب غفرلہ)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ انتہائی درویش صفت اور عابد و زاہد صحابی تھے' آپ ؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : "مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّنْظُرَ اِلٰى زُهْدِ عِيْسٰى فَلْيَنْظُرْ اِلٰى اَبِي ذَرٍّ" (جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زہد دیکھنا ہو وہ ابوذر کو دیکھ لے) سلسلة الاحادیث الصحیحة للالبانی ح ۲۳۴۳۔ بعض روایات میں "تَوَاضُع" کا لفظ بھی آیا ہے۔ (ماخوذ)

اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو"۔ میں نے تیسری دفعہ دریافت کیا : خواہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ آپؐ نے فرمایا "ابوذر کے ناک کے علی الرغم خواہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو (وہ جنت میں داخل ہو گا)"۔

اب ایک طرف اس معنی کی احادیث موجود ہیں (ہم نے صرف چند ایک کا تذکرہ کیا ہے) جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف کلمۂ توحید کہنے سے انسان جنت میں داخل ہو جائے گا اور اس پر آگ حرام ہے خواہ اس نے برائیوں کا ارتکاب کیا ہو' دوسری طرف ایسی احادیث موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف کبائر بلکہ محض کج خلقی پر بھی ایمان کی نفی ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ والی روایت میں گناہ کبیرہ کی بات آئی تھی' فوری تقابل کرتے ہوئے گناہ کبیرہ کے ضمن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت بھی دیکھ لیں :

عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ : ((لاَ يَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَلاَ يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَلاَ يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ' وَلاَ يَنْتَهِبُ نُهْبَةً ذَاتَ شَرَفٍ يَرْفَعُ الْمُسْلِمُوْنَ اِلَيْهَا اَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ)) (۲)

---

(۲) صحیح البخاری' کتاب المظالم' باب النهبی بغیر اذن صاحبه' ح ۲۴۷۵۔ نیز ح ۵۲۵۶ و ۶۳۹۰ و ۶۴۲۵۔ و صحیح مسلم' کتاب الایمان' بیان نقصان الایمان بالمعاصی .... الخ ح ۵۷ (سات سندوں کے ساتھ) وسنن ابی داؤد' کتاب السنة' باب الدلیل علی زیادة الایمان و نقصانه' ح ۴۶۸۹۔ و سنن الترمذی' کتاب الایمان' باب ماجاء لایزنی الزانی وهومئومن' ح ۲۶۲۵۔ و سنن النسائی' کتاب الاشربه' باب ذکر الروایات المغلظات فی شرب الخمر' ح ۵۶۷۵ و ۵۶۷۶ وسنن ابن ماجه' کتاب الفتن' باب النهی عن النهبة' ح ۳۹۳۶ و صحیح ابن حبان' ۴۱۴/۱ ح ۱۸۶۔ وسنن البیهقی ۱۸۶/۱۰۔ وسنن الدارمی ۸۷/۲' ح ۱۹۸۳۔ و ۱۱۵/۲ ح ۲۱۰۸۔ ومسند احمد ۳۷۶/۲ و کتاب الایمان لابن منده' ح ۵۱۰ و ۵۱۱ و ۵۱۲۔ ومصنف ابن ابی شیبه ۳۲/۱۱ و الشریعة للاجری' ص ۱۱۳ و شرح السنة للبغوی ۸۷/۱ باب الکبائر' ح ۴۶ و ۴۷۔ یہاں بھی بخاری و مسلم کا حوالہ بہت کافی تھا لیکن حقیقت ایمان (باقی اگلے صفحہ پر)

"کوئی زانی حالت ایمان میں زنا نہیں کرتا' کوئی چور حالت ایمان میں چوری نہیں کرتا' کوئی شرابی حالت ایمان میں شراب نہیں پیتا اور کوئی اچکا حالت ایمان میں ایسی چیز نہیں اٹھاتا جس کی کوئی قیمت ہو اور مسلمانوں کی نگاہیں اس کی طرف متوجہ ہوتی ہوں۔"

تو گویا ایسے کبائر کی وجہ سے ایمان کی نفی ہو گئی۔ اسی طرح اگر کسی مسلمان میں امانت داری کا وصف نہیں ہے تو اس کے بارے میں بھی ایمان کی نفی وارد ہوئی ہے۔
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ :

((قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلاَّ قَالَ : ((لاَ اِيْمَانَ لِمَنْ لاَّ اَمَانَةَ لَهٗ وَلاَ دِيْنَ لِمَنْ لاَّ عَهْدَ لَهٗ)) (۷)

"شاذ ہی کبھی ایسا ہوا ہو گا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور آپ نے اس میں یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں : "لاَ اِيْمَانَ لِمَنْ لاَّ اَمَانَةَ لَهٗ وَلاَ دِيْنَ لِمَنْ لاَّ عَهْدَ لَهٗ" یعنی جو امانت دار نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں اور جو عہد کو وفا نہیں کرتا اس کا کوئی دین نہیں ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں یہ موضوع اور زیادہ وضاحت اور شدت کے ساتھ آیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((وَاللّٰهِ لاَ يُؤْمِنُ' وَاللّٰهِ لاَ يُؤْمِنُ ' وَاللّٰهِ لاَ يُؤْمِنُ)) قِيْلَ مَنْ يَّارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((اَلَّذِيْ لاَ يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ)) (۸)

(گزشتہ سے پیوستہ) سمجھنے میں یہ حدیث اہم مقام رکھتی ہے اس لئے دستیاب حوالوں سے تخریج کر دی ہے۔ واضح رہے کہ یہ حدیث حضرت ابن عباس' ابن عمرو اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔

(۷) مسند احمد ۱۳۵/۳ اور ۱۵۴ اور ۲۱۰ و البیهقی السنن الکبری ۲۸۸/۶ ۔ و ۲۳۱/۹ و صحیح ابن حبان ۴۲۲/۱ کتاب الایمان' باب فرض الایمان' ح ۱۹۴۔ و مصنف ابن ابی شیبه ۱۵۹/۶' ح ۳۰۳۱۱۔ اور حدیث حسن ہے۔

(۸) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب اثم من لا یامن جاره بوائقه (باقی اگلے صفحہ پر)

"خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہو سکتا' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہو سکتا' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہو سکتا"۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا : اے اللہ کے رسول' کون شخص؟ فرمایا : "وہ شخص کہ جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی چین میں نہیں ہے"۔

ذرا غور کریں کہ اس حدیث میں نہ کسی گناہ کبیرہ کا تذکرہ ہے نہ عرف عام کے مطابق کسی بڑے جرم کی بات ہے۔ پھر بھی کس قدر زور دے کر بلکہ تین مرتبہ قسم کھا کر فرمایا : ایسا آدمی مؤمن نہیں ہے۔

آگے بڑھ کر ایک اور حدیث کو دیکھیں۔ مختلف کتب حدیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے جو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ [9] کے ساتھ یا بعض روایات کے مطابق حضرت اسامہ اور ایک دوسرے انصاری صحابی رضی اللہ عنہما کے ساتھ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ایک جنگ میں ان کا مقابلہ ایک کافر کے ساتھ ہو گیا اور اس پر قابو پا لیا گیا۔ جب کافر نے دیکھا کہ اب تو میرا کوئی بس نہیں چل سکتا تو اس نے جھٹ "اَشْهَدُ اَنْ لاَّ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" کہہ دیا۔ اس موقع پر انصاری صحابیؓ نے تو اپنا نیزہ روک لیا البتہ حضرت اسامہؓ نے وار کر کے اس کافر کو ہلاک کر دیا۔ بعض روایات کے مطابق اس کے بعد حضرت اسامہؓ کو ذہنی خلش لاحق ہو گئی اور

(گزشتہ سے پیوستہ) ح ۵۶۷۰۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان تحریم ایذاء الجار ح ۴۶ (الفاظ مختلف ہیں) و مسند احمد ۲۸۸/۲ و ۳۳۶۔ و المستدرک للحاکم ۱۰/۱ و ۱۶۵/۴۔ یہی حدیث حضرت ابو الشریح سے بھی مروی ہے' ملاحظہ ہو صحیح البخاری حوالہ سابقہ و مسند احمد ۳۱/۴ و ۳۸۵/۶۔

(9) حضرت اسامہ بن زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما حضور کو بہت پیارے تھے بالکل پوتوں کی طرح' کیونکہ حضرت زیدؓ کو آپ ﷺ نے اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ ایک عرصے تک تو وہ زید بن محمدؐ ہی کہلاتے رہے' پھر جب سورۃ الاحزاب میں یہ حکم نازل ہو گیا کہ اسلام میں متبنی کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ انہیں ان کے والد کے نام سے پکارا جائے تو اس کے بعد حضرت زید رضی اللہ عنہ کو زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ حضرت اسامہ ان کے بیٹے تھے (ماخوذ)

انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا اور دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات کسی طرح آپ ﷺ کو معلوم ہو گئی تو آپ نے از خود حضرت اسامہؓ سے دریافت کیا اور معلوم ہو جانے پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا۔ فرمایا :

((مَنْ لَكَ بِلاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ' اِنَّمَا قَالَهَا مَخَافَةَ السَّلاَحِ۔ قَالَ : ((اَفَلاَ شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهٖ حَتّٰى تَعْلَمَ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ قَالَهَا اَمْ لاَ؟ مَنْ لَكَ بِلاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟)) فَمَا زَالَ يَقُوْلُهَا حَتّٰى وَدِدْتُ اَنِّیْ لَمْ اُسْلِمْ اِلاَّ يَوْمَئِذٍ)) (۱۰)

"قیامت کے روز لا الٰہ الا اللہ کے استغاثے سے تم کو کون بچائے گا؟" میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ اس نے تو ہتھیار کے ڈر سے یہ کلمہ پڑھا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: "تم نے اس کا دل چیر کے کیوں نہ دیکھ لیا تاکہ تمہیں معلوم ہو جاتا کہ اس نے ڈر سے کہا یا صدقِ دل سے کہا۔ سوچو قیامت کے روز لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کے استغاثے سے تم کو کون بچائے گا؟" آپؐ نے یہ جملہ اس تکرار کے ساتھ کہا کہ میں تمنا کرنے لگا کہ اے کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا"۔

آپ ﷺ نے حضرت اسامہؓ کے پیش کردہ عذر کی نفی نہیں کی' بس اس بات پر زور دیا کہ کل قیامت کے روز جب "لا الٰہ الا اللہ" کا کلمہ استغاثہ لے کر اللہ کے حضور پیش ہو جائے گا تو کیا جواب دو گے' کیا منہ دکھاؤ گے' کیونکہ یہ کلمہ تو کلمۂ سلامتی ہے' اسلام کا کلمہ ہے' جس نے یہ کلمہ ادا کر دیا اسے تو سلامتی مل گئی۔ (۱۱)

مذکورہ بالا آیات اور احادیث کو سامنے رکھ کر غور کریں تو متعدد سوالات

---

(۱۰) سنن ابی داؤد' کتاب الجهاد' باب علی ما یقاتل المشرکون ح ۲۶۴۳۔ یہی حدیث تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ ملاحظہ کریں : صحیح البخاری' کتاب المغازی' باب ۴۳ ح ۴۰۲۱۔ و کتاب الدیات باب ۱ ح ۶۴۷۸۔ و صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب تحریم قتل الکافر بعد ان قال لا اِلٰه الا اللّٰه ح ۹۶۔

(۱۱) محترم ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ کے جملے کی بنیاد درج ذیل حدیث ہے : حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا : "مجھے حکم ملا ہے کہ میں (باقی اگلے صفحہ پر)

سامنے آتے ہیں۔

۱) آیا تصدیق و اقرار سے ہی نجاتِ اخروی مل جائے گی یا عمل صالح بھی مطلوب ہے؟

۲) عمل صالح ایمان کا جزو ہے یا اضافی چیز ہے؟

۳) ارتکاب کبائر سے ایمان ختم ہو جاتا ہے؟ یا وقتی طور پر اوپر اٹھ جاتا ہے؟ یا علیٰ حالہ باقی رہتا ہے؟

۴) کیا ایمان اعمالِ صالحہ سے بڑھتا ہے؟ اور گناہوں سے کم ہوتا ہے؟ یا اس کی کیفیت و ماہیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا؟

یہ سوالات یقیناً خاصے ثقیل ہیں اور ان کو سمجھے بغیر حقیقت ایمان کو پانا بھی ناممکن ہے' اس لئے ان کے جوابات جاننا اشد ضروری ہیں۔ ان جوابات کو جاننے اور اچھی طرح سمجھنے سے پہلے "حقیقت ایمان' اعمال صالحہ کا اس کے ساتھ تعلق اور گناہوں کے ایمان پر اثرات" کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔

مختلف مکاتیب فکر کے ہاں "ایمان" کی تعبیر و توجیہہ

تاریخ اسلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتقادات کی تعبیر و توجیہہ کے سلسلہ میں متعدد گروہ پیدا ہوئے ہیں۔ ان گروہوں کے اعتقادات اور دلائل کا پہلے مطالعہ کرلیں تاکہ نتائج تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

۱) خوارج[۱۴]

عقیدہ : عمل صالح ایمان کا جزو لازم یا جزو لاینفک ہے۔ اگر اس جزو کو ساقط کر دیا

(گزشتہ سے پیوستہ) اس وقت تک لوگوں سے جنگ کرتا رہوں جب تک وہ لاالٰہ الااللہ نہ کہہ دیں اور جس نے لاالٰہ الااللہ کہہ دیا اس کو جان و مال کی سلامتی مل گئی مگر حق اسلام کے ساتھ' اور اس کا حساب اللہ کے ذمے ہے" (بخاری' مسلم' ترمذی' ابوداؤد اور نسائی)

(۱۴) خوارج سے منسوب فرقہ اس وقت دنیا میں کہیں نہیں ہے بس عمان کے (باقی اگلے صفحہ پر)

جائے تو کُل بھی ساقط ہو جاتا ہے ـــــ اور اسلام کا دارومدار ایمان پر ہے' للذا اگر عمل صالح نہیں ہے' بالخصوص اگر گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوا ہے تو نہ ایمان باقی بچا اور نہ اسلام کام آیا اور انسان کفر میں داخل ہو گیا۔

نتیجہ : گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر قرار پایا' ملت اسلام سے باہر نکل گیا' مرتد قرار پایا' اس کی جان و مال سب کچھ مباح و حلال ہو گئے اور وہ واجب القتل ہو گیا۔

خوارج کے بارے میں اہل اسلام کا فیصلہ : عہد صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ خوارج اسلام سے باہر ہیں' کافر ہیں اور واجب القتل ہیں۔ اسی لئے خلیفہ برحق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کے خلاف قتال کیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اکثریت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا۔

۲) معتزلہ

عقیدہ : ان کا عقیدہ اور خوارج کا عقیدہ ایک ہے کہ عمل صالح ایمان کا جزو لازم ہے۔ اگر اس جزو کو ساقط کر دیا جائے تو کُل ساقط ہو جاتا ہے ـــــ اور اسلام کا دارومدار ایمان پر ہے للذا اگر عمل صالح نہیں ہے اور بالخصوص اگر گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوا ہے تو نہ ایمان باقی بچا اور نہ اسلام کام آیا۔ تاہم معتزلہ کے نزدیک وہ کافر نہیں ہوا صرف اسلام و ایمان سے نکلا ہے۔

نتیجہ : گناہ کبیرہ کا مرتکب اسلام سے تو نکل گیا البتہ کافر نہیں ہوا' للذا مرتد اور کافر

(گزشتہ سے پیوستہ) علاقے میں رماتیہ فرقے کے نام سے ایک گروہ پایا جاتا ہے جن کے اعتقادات خوارج سے قریب تر ہیں لیکن اس قدر متشدد نہیں بلکہ معتدل قسم کے لوگ ہیں۔ دوسری بات یہ نوٹ کر لیں کہ خوارج ذاتی زندگیوں میں انتہائی پارسا تھے' فرائض کے پابند اور کبائر سے کوسوں دور رہنے والے' کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے انسان اسلام سے نکل کر کفر میں داخل ہو جاتا ہے۔ للذا ان کی عمل میں پارسائی کسی کو غلط فہمی میں مبتلا نہ کر دے بلکہ حقائق کو دلائل کی روشنی میں سمجھنا چاہئے ظاہر پر نہیں جانا چاہئے۔ (ماخوذ)

والے احکام اس پر لاگو نہیں ہوں گے۔ گویا ان کے نزدیک کفر و اسلام کے درمیان بھی کوئی منزل ہے اور وہ کفر و اسلام کے درمیان لٹکا ہوا ہے۔ معتزلہ کے موقف کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو یہ خوارج والا موقف ہی ہے' بس اس پر کافروں والے احکام نافذ نہیں ہوتے یعنی وہ نہ مرتد ہے نہ واجب القتل' نہ اس کی ذات حلال الدم اور نہ اس کا مال حلال۔ البتہ یہ طے ہے کہ معتزلہ کے نزدیک بھی خوارج کی طرح کبیرہ گناہ کا مرتکب اسلام اور ایمان سے خارج ہو گیا۔

۴) محدثین

عقیدہ : امام مالک' امام شافعی' امام احمد بن حنبل' امام بخاری اور دیگر محدثین رحمہم اللہ کا عقیدہ ہے کہ : "الایمانُ قولٌ و عملٌ یزید بالطاعةِ ویَنْقَصُ بِالْمَعْصِیَةِ" یعنی "ایمان قول و عمل کا نام ہے' جو اطاعت و نیکی سے بڑھتا ہے اور گناہ کرنے سے کم ہو جاتا ہے"۔

ان حضرات کے نزدیک بھی عمل ایمان کا لازمی جزو ہے لیکن گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے انسان نہ ایمان و اسلام سے نکلتا ہے اور نہ ہی کفر میں داخل ہوتا ہے[۱۳]۔

نتیجہ : گناہ کبیرہ سے انسان ایمان و اسلام سے نکلے گا تو نہیں' البتہ گناہ کی کمیت و کیفیت کی نسبت سے ایمان کم ہو جائے گا۔

---

(۱۳) محدثین کی عظیم اکثریت صرف "تارکِ نماز" کو اسلام سے خارج قرار دیتی ہے جبکہ وہ بالکلیہ ہی چھوڑ بیٹھے۔ اس کے علاوہ دس کام ایسے ہیں جو انسان کو اسلام سے خارج کر دیتے ہیں جو کہ "نواقض اسلام" کے نام سے مشہور ہیں۔ محدثین کے ساتھ ساتھ فقہاء احناف بھی ان کے قائل ہیں : (۱) شرک اپنی جملہ اقسام کے ساتھ (۲) اللہ اور بندوں کے درمیان واسطے بنانا (۳) کافروں یا مشرکوں کو کافر نہ ماننا (۴) شریعت محمدی میں نقص نکالنا (۵) شرعی احکام سے بغض رکھنا (۶) شرعی احکام کا مذاق اڑانا (۷) جادو کرنا یا کروانا (۸) مسلمانوں کے مقابلے میں کافروں کی مدد کرنا (۹) کسی کو شرعی احکام سے مستثنیٰ قرار دینا (۱۰) اللہ کے دین سے بے رُخی اختیار کرنا۔ (اضافہ از مرتب ابو عبدالرحمٰن)

۴) فقہاءِ احناف

عقیدہ : ایمان نام ہے تصدیق و اقرار کا' یعنی دل سے تصدیق اور عمل میں اقرار۔ چاہے کوئی آدمی گناہ کبیرہ بھی کرے اس کو کافر نہیں کہا جائے گا' البتہ اعمال سے ایمان کی کیست میں کمی بیشی ہوتی ہے (نیک اعمال سے اضافہ اور گناہوں کی وجہ سے کمی) تاہم تصدیق جوں کی توں رہتی ہے۔

نتیجہ : کبیرہ گناہوں کے باعث کسی کی تکفیر نہیں کی جائے گی' البتہ جن احادیث میں کبیرہ گناہوں کی وجہ سے ایمان کی نفی کی گئی ہے اس کی توجیہہ فقہاء احناف کے نزدیک یہ ہے کہ "یہ کمال ایمان کی نفی ہے' نفس ایمان کی نفی نہیں۔ اس طرح "وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ" کا ترجمہ ان کے نزدیک ہوگا "خدا کی قسم اس شخص کا ایمان کامل نہیں"۔ احناف کے موقف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کسی انسان کے دل میں ایمان ہے تو بالآخر وہ سزا پا کر جہنم سے نکل آئے گا اور جنت میں داخل ہوگا۔

نوٹ : محدثین کا موقف اور فقہاء احناف کا موقف اہل سنت و جماعت ہی کا موقف سمجھا جاتا ہے۔ ان میں کہیں کہیں فرق تو ضرور ہے لیکن باہم قریب تر ہیں۔

۵) مُرجیئہ

عقیدہ : ایمان صرف اعتقاد و اقرار کا نام ہے' ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ نقصان نہیں دیتا جس طرح کہ کفر کے ہمراہ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی۔ مؤمن صرف ایمان کی بدولت جنت میں جائے گا اور کافر اپنے کفر کی پاداش میں جہنم میں جائے گا' اس سے اعمال کا کوئی تعلق نہیں۔

نتیجہ : مُرجیئہ کے نزدیک دل میں ایمان رکھنے والا اور زبان سے اقرار کرنے والا مکمل مؤمن ہے اور چاہے فرائض کی پابندی کرے یا نہ کرے' جنت کا حقدار ہے۔ کبیرہ گناہ جتنے چاہے کرتا رہے' وہ کسی شکل میں جہنم میں نہیں جائے گا۔

مُرجیۂ اور اہل سنت میں اصولی فرق : مُرجیۂ کے نزدیک مؤمن جہنم میں داخل ہی نہیں ہو گا جبکہ اہل سنت یعنی احناف اور محدثین کے نزدیک ایمان کے بعد نجات کا دارومدار اعمال پر ہے۔ اگر نیکیوں کا پلڑا بھاری رہا تو بمشیۃ اللّٰہ وہ بغیر سزا کے ہی جنت میں چلا جائے گا اور اگر نیکیوں کے مقابلہ میں گناہوں کا پلڑا بھاری رہا تو اپنے گناہوں کی سزا پا کر وہ بالآخر جہنم سے نکل آئے گا اور جنت میں داخل ہو گا۔

نصوصِ تبشیر (جن آیات و احادیث میں خوشخبریاں وارد ہوئی ہیں) اور نصوصِ وعید و نذیر (جن آیات و احادیث میں دھمکی و سخت گیری وارد ہوئی ہے) کو جمع کرنے کے بعد اہل سنت کا موقف ہی برحق ہے۔

٦) کرامیہ

عقیدہ : کرامیہ کے نزدیک ایمان نام ہے بس لاالٰہ الااللہ کہنے کا، یعنی صرف قول کا۔ دل میں تصدیق ہے یا نہیں، اعمالِ صالحہ کا اہتمام ہے یا نہیں اور کبائر سے پرہیز کیا ہے یا نہیں کیا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لاالٰہ الااللہ زبان سے پڑھ دیا بس کافی ہو گیا۔

نتیجہ : مذکورہ بالا ایمان کے بعد بس جنت پکی اور جہنم سے آزادی یقینی ہے، زندگی جس طرح چاہو گزارتے رہو۔

مُرجیۂ اور کرامیہ میں فرق : عملاً مُرجیۂ اور کرامیہ میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ مُرجیۂ کے نزدیک تصدیق شرط ہے جس کا فیصلہ دنیا میں نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا دونوں کا موقف یہی ہے کہ بس لاالٰہ الااللہ کہو اور جنت کے "زبردستی حقدار" بن جاؤ۔

٧) اشاعرہ

عقیدہ : ایمان صرف اعتقاد کا نام ہے اور اقرار شرط کا درجہ رکھتا ہے جزو نہیں۔ کیونکہ شرعی احکام اقرار سے منسلک ہیں لہٰذا اقرار شرط ہے۔

مُرجیۂ اور اشاعرہ میں فرق : مُرجیۂ کے نزدیک تصدیق قلبی اور زبانی اقرار ایمان کے اجزاء ہیں جبکہ اشاعرہ کے نزدیک صرف تصدیق کا نام ایمان ہے، اقرار تو

اظہارِ ایمان کا ذریعہ ہے۔

اشاعرہ کے مسلک کی بنیاد

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ :

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ وَمُعَاذٌ رَدِیْفُهٗ عَلَی الرَّحْلِ، قَالَ : ((یَا مُعَاذُ بْنَ جَبَلٍ)) قَالَ : لَبَّیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَیْكَ، قَالَ : ((یَا مُعَاذُ)) قَالَ : لَبَّیْكَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَسَعْدَیْكَ، ثَلَاثًا، قَالَ : ((مَا مِنْ اَحَدٍ یَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، صِدْقًا مِنْ قَلْبِهٖ، اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَی النَّارِ)) قَالَ : یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، اَفَلَا اُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَیَسْتَبْشِرُوْا؟ قَالَ : ((اِذًا یَتَّکِلُوْا)) وَاَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهٖ تَاَثُّمًا)) (۱۴)

''ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ سواری پر تھے اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہ آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، آپؐ نے فرمایا ''اے معاذ بن جبل!'' انہوں نے جواب دیا : ''اے اللہ کے رسول میں حاضر اور متوجہ ہوں''۔ آپ ﷺ نے دوبارہ کہا : ''اے معاذ!'' انہوں نے جواباً کہا : ''میں حاضر اور متوجہ ہوں'' اور پھر اسی طرح تیسری دفعہ کہا۔ پھر آپؐ نے فرمایا : ''جو کوئی بھی دل کی سچائی کے ساتھ گواہی دے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبودِ حقیقی نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اللہ نے اس پر آگ کو حرام کر دیا ہے۔'' حضرت معاذؓ نے دریافت کیا : کیا میں لوگوں کو یہ خوشخبری نہ دے دوں تاکہ وہ بھی خوشیاں منائیں؟ آپؐ نے فرمایا : ''تب تو وہ اسی بات پر سہارا کر کے بیٹھ جائیں گے''۔ حضرت معاذ نے یہ حدیث موت کے وقت بتلائی تاکہ علم چھپانے کے جرم میں گناہگار نہ ہو جائیں''۔

---

(۱۴) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من خص بالعلم قوما دون قوم، ح ۱۲۸۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من مات علی التوحید دخل الجنۃ قطعًا، ح ۳۲۔ و دیگر کتب حدیث۔

اس حدیث سے اشاعرہ اور مُرجیہٴ کے موقف و مسلک کی تائید ہوتی ہے۔

وضاحت

رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو ایک علم دیا اور ساتھ ہی منع بھی کر دیا کہ اسے عام نہ کیا جائے' کیونکہ ہر آدمی تو دلائل شریعت کو پوری گہرائی سے نہیں سمجھ سکتا اور حضرت معاذ نے اس راز کو سینے میں دبائے رکھا تاکہ آپ ﷺ کے حکم کی نافرمانی نہ ہو جائے اور پھر زندگی کے آخری لمحات میں اسے بیان کر دیا کہ کہیں کتمانِ علم کا جرم ان کے ذمے نہ لکھ دیا جائے۔ یہاں سے یہ قاعدہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر بات ہر انسان کو نہیں بتائی جا سکتی۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے :
"حَدِّثُوا النَّاسَ بِمَا يَعْرِفُوْنَ اَتُحِبُّوْنَ اَنْ يُكَذَّبَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ"[(۱۵)] "لوگوں کو اتنی بات بیان کرو جو ان کی سمجھ میں آسکے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلا دیا جائے"۔

۸) اہل تشیع

عقیدہ : اہل تشیع کا عقیدہ معتزلہ والا ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب اسلام سے تو نکل جاتا ہے البتہ کفر میں داخل نہیں ہوتا۔ البتہ اہل تشیع نے ایک قدم آگے بڑھایا اور دنیا میں ہی فیصلے کرنے شروع کر دیئے کہ فلاں مؤمن ہے' فلاں مسلمان ہے' فلاں منافق ہے اور فلاں کافر ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کے صحیح فیصلے تو قیامت کے روز ہوں گے' دنیا میں تو ہم صرف ظاہر کے اعتبار سے فیصلہ کریں گے' کسی کا دل چیر کر تو نہیں دیکھ سکتے۔ اسی جرأت کا نتیجہ ہے کہ اہل تشیع کے نزدیک صرف چند صحابہ مؤمن تھے باقی کچھ مسلمان' اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی غالب اکثریت "منافق" تھی۔

اس طویل بحث کے نتیجے میں گناہ کبیرہ سے متعلق آٹھ مسلکوں یا فرقوں کا عقیدہ

---

(۱۵) صحیح البخاری' کتاب العلم ح ۱۲۷۔ مذکورہ بالا نوٹ کا غالب حصہ تو ڈاکٹر صاحب کے بیان میں موجود تھا' البتہ حضرت علیؓ کا قول میری طرف سے تائیدی اضافہ ہے۔ (از مرتب)

ہمارے سامنے آگیا ہے۔ ان آٹھ گروہوں کو ایک دوسری ترتیب سے دیکھیں تو یہ کل چار نظر آئیں گے :

۱) صرف اقرار : یہ کرامیہ کا قول ہے۔ یہ لوگ صرف اقرار و نطق کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ وہ احادیث کو ان کے ظاہری معنیٰ میں لیتے ہیں جن میں کہا گیا ہے "مَنْ قَالَ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ"۔ کلمہ پڑھ کر اعمال سے چھٹی ہو گئی' اب جو چاہو کرتے رہو۔

۲) صرف تصدیق : یہ اشاعرہ کا مسلک ہے۔ ان کے خیال میں جب دل میں ایمان موجود ہے تو اقرار تو خود بخود ہو ہی جائے گا۔ اِلاَّ یہ کہ انسان مجبور ہو اور مجبور انسان پر عمومی احکام لاگو نہیں ہوتے۔

۳) تصدیق اور اقرار : یہ مُرجیۂ اور فقہاءِ احناف کا قول ہے۔ مُرجیۂ کا عقیدہ ہے کہ جب دل میں تصدیق اور زبان پر اقرار موجود ہے تو پھر چاہے گناہ پر گناہ کرتے جاؤ' کوہ ہمالیہ جتنے گناہ بھی کر لو' پھر بھی آگ میں داخل ہونے کا سوال ہی نہیں۔

تاہم فقہاء احناف کے نزدیک تصدیق و اقرار تو شرط ایمان ہے' البتہ اعمالِ صالحہ ضروری ہیں' شرط نہیں۔ لہٰذا اگر نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے تو باذن اللہ جنت میں جائے گا ورنہ سزا پا کر جنت میں جائے گا۔

۴) تصدیق' اقرار اور عمل : یہ مسلک محدثین' معتزلہ اور خوارج کا ہے۔ محدثین اعمال کو ایمان کا حصہ شمار کرتے ہیں۔ البتہ گناہ کبیرہ کی وجہ سے کسی کو ایمان سے خارج نہیں کرتے۔

معتزلہ کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب اسلام سے تو خارج ہو گیا البتہ کفر میں داخل نہیں ہوا کیونکہ ان کے نزدیک اعمال صالحہ ایمان کے لئے شرط کا درجہ رکھتے ہیں۔

خوارج کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب اسلام سے خارج ہو کر کفر میں داخل ہو جاتا ہے اور مُرتد' واجب القتل مباح المال والدم قرار پاتا ہے۔

سابقہ بحث کے لازمی نتائج

- خوارج اور کرامیہ گمراہی کی انتہاؤں پر ہیں 'کیونکہ : کرامیہ کے نزدیک صرف اقرار کافی ہے 'نجات کے لئے نیک اعمال یا برے کردار کا کوئی دخل نہیں۔ دوسری انتہا پر خوارج ہیں۔ ان کے نزدیک جس سے گناہ کبیرہ سرزد ہوا وہ فوراً کافر' خارج از اسلام' واجب القتل اور حلال الدم والمال ہو گیا —— یہ دونوں مسلک شدید گمراہی میں مبتلا ہیں۔
- معتزلہ کا مسلک علمی اعتبار سے شدید مہمل اور بے بنیاد ہے۔ گناہ کبیرہ کا مرتکب ان کے نزدیک ایمان سے تو نکل گیا البتہ کفر میں داخل نہیں ہوا۔ گویا ان کے نزدیک اسلام اور کفر کے درمیان کوئی No man's land موجود ہے۔ حالانکہ اسلام و کفر کے درمیان کوئی تیسری منزل نہیں ہے 'یا اسلام یا کفر' ادھر یا ادھر —— اس لئے میرے نزدیک علمی اعتبار سے معتزلہ کا موقف مہمل اور بے بنیاد ہے۔
- فقہاء احناف اور محدثین بشمول امام مالک' امام احمد بن حنبل اور امام شافعی رحمہم اللہ کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب دائرہ اسلام میں ہے' اس کا ایمان سلامت ہے۔ تاہم آخرت کا فیصلہ ایمان کے بعد اعمال صالحہ کے مطابق ہو گا —— یہی رائے عادلانہ و منصفانہ اور ہر دو طرح کے دلائل کو حاوی و شامل ہے۔

میرا مسلک اور وضاحت

اب میں اپنا مسلک بیان کر رہا ہوں' لیکن اس وضاحت کے ساتھ کہ بعض حضرات نے (میرے شدید احتجاج کے علی الرغم) مجھے خوارج اور معتزلہ سے جوڑ دیا ہے۔ اور میں قسمیں کھا کھا کر کہتا ہوں کہ :

میرا عقیدہ ہرگز نہیں ہے کہ : "گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو گیا ہے"

اور نہ ہی میں یہ سمجھتا ہوں کہ:

''وہ ایمان اور اسلام دونوں سے نکل گیا ہے''

البتہ یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ:

جب کوئی شخص گناہ کبیرہ کے ارتکاب میں عملاً مشغول ہوتا ہے تو اُس وقت اس کا دل ایمان سے قطعاً خالی ہوتا ہے ——— اور جیسے کہ امام ترمذیؒ نے ایک حدیث نبویؐ کے ضمن میں (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) حضرت محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے: ''وہ شخص ایمان سے نکل کر صرف اسلام میں رہ جاتا ہے!'' (''خَرَجَ مِنَ الْاِیْمَانِ اِلَی الْاِسْلَامِ ''!) ——— البتہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی محولہ بالا حدیث نبویؐ سے' جسے امام ترمذیؒ نے ابواب الایمان میں درج کیا ہے ——— اور امام ابوداؤدؒ نے کتاب السنۃ میں شامل کیا ہے' معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی بندۂ مومن گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے تو ایمان اس کے دل سے نکل کر اس کے سر پر سائبان کی طرح معلق ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ بندہ اپنے فعل قبیح سے فارغ اور خارج ہو جاتا ہے تو ایمان بھی واپس دل میں داخل ہو جاتا ہے ——— !! تو اگرچہ سورۃ الفرقان کی آیات ۶۸ تا ۷۰ کی رو سے بھی' اور عقلی و منطقی اعتبار سے بھی' یہ محسوس ہوتا ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے بعد ''تجدید ایمان'' توبہ سے مشروط ہونی چاہئے لیکن اسے بھی سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ کی طرح اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی و غفاری کا مظہر اور صدقہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ باضابطہ توبہ کا انتظار نہیں کرتا بلکہ گناہ سے فراغت کے فوراً بعد ایمان لوٹا دیتا ہے۔ واللہ اعلم!

ایک مشکل اور اس کا حل

جن آیاتِ قرآنی یا احادیث میں بدعملی یا گناہوں کی بنیاد پر ایمان کی نفی کی گئی ہے یا خلود فی النار (ہمیشہ آگ میں رہنا) کی وعید آئی ہے' جب آپ ان کی ترجمانی کریں گے تو ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ کہیں کہ: ''اس میں کمال ایمان کی نفی ہے' نفس ایمان کی نفی نہیں ہے''۔

اس ترجمے سے لوگوں کے لئے ترہیب' انذار' خوف اور دھمکی کا عنصر ختم ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک نصوص قرآنی و احادیث کو ان کے اصلی الفاظ کے ساتھ باقی رکھنا چاہئے۔ البتہ حاشیہ میں یہ وضاحت آ جائے کہ اس سے مراد ایسا کفر نہیں ہے جو انسان کو حدودِ اسلام سے نکال کر حدودِ کفر میں داخل کر دے!

مثلاً حدیث کے الفاظ ملاحظہ کریں : وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ــ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ــ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ــ "خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے' قسم بخدا وہ شخص مؤمن نہیں ہے' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے"۔ تصور کیجئے کہ سننے والا انسان کانپ اٹھے گا۔

دوسرا ترجمہ ملاحظہ کریں : "خدا کی قسم وہ شخص حقیقی مؤمن نہیں ہے' خدا کی قسم اس کا ایمان کامل نہیں ہے' اللہ کی قسم اس شخص کے پاس کمال ایمان نہیں ہے"۔ ذرا غور کریں کہ سننے والے پر ذرا اثر بھی نہ ہو گا۔ وہ دل میں خیال کرے گا کہ کمال ایمان تو بڑی دُور کی چیز ہے' ہمیں تو ٹارچ والا ایمان مل جائے تو بہت غنیمت ہے۔ اس کے بعد کون آدمی دین کی خاطر قربانی دے گا اور کون عیش و عشرت چھوڑ کر کانٹوں بھری راہ کا انتخاب کرے گا۔

دوسری طرح ترجمہ کرنے سے ترہیب و تخویف کا سارا زور ختم ہو گیا۔ یہی بات مولانا محمد منظور نعمانی (رحمہ اللہ) نے اپنی معرکۃ الآراء تالیف "معارف الحدیث" جلد اول میں لکھی ہے کہ "اس قسم کی احادیث کی نحوی ترکیب میں تاماً یا کاملاً جیسے الفاظ مقدر (Understood) ماننے کی بالکل ضرورت نہیں ہے' بلکہ ایسا کرنا ایک قسم کی بدذوقی ہے۔

میں تو ایک قدم آگے بڑھا کر یہ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ نبی ﷺ کی توہین ہے۔ کیا نبی اکرم ﷺ کو (معاذ اللہ) عربی نہیں آتی تھی؟ کیا آپؐ اپنے مافی الضمیر کو بیان نہیں کر سکتے تھے؟ کیا آپؐ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ میں کمال ایمان کی نفی کر رہا ہوں حقیقی ایمان کی نفی نہیں کر رہا' جبکہ آپؐ نے کمال ایمان کو مثبت انداز میں بیان فرمایا ہے :

﴿ مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ ﴾ (۱۷)

---

(۱۷) سنن ابی داوٗد' کتاب السنۃ' باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ح ۴۶۸۱۔ و مسند احمد ۴۳۸/۳ (بروایت ابو امامہ الباہلی رضی اللہ عنہ) دوسری روایت حضرت معاذ بن انس الجہنی سے ہے : سنن الترمذی' کتاب صفۃ القیامۃ' باب ۶۱' ح ۲۵۲۳۔ علامہ الالبانی نے تحقیق سنن ابی داوٗد میں حدیث کو صحیح کہا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ ۶۵۷/۱' ح ۳۸۵۔

"جس نے محبت کی تو اللہ کے لئے کی' اور عداوت (دشمنی) رکھی تو اللہ کے لئے رکھی' کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا اور کسی سے کچھ روکا تو اللہ کے لئے روکا' اس شخص نے اپنے ایمان کو کامل کر دیا"۔

جب مثبت معنی میں "اِسْتَکْمَلَ" کالفظ استعمال ہو سکتا ہے تو منفی معنی میں بھی اس لفظ کو استعمال کرنا آپ ﷺ کے لئے مشکل یا محال نہ تھا۔ آپ تو افصح العرب ہیں۔

ذرا غور کریں کہ آپ ﷺ تو فرما رہے ہیں : وَاللّٰہِ لاَ یُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰہِ لاَ یُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰہِ لاَ یُؤْمِنُ' تاکہ لوگ لرز اٹھیں' کانپ جائیں ـــــ ہوش میں آ جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ بے شعوری میں کسی کا طرز عمل ایسا ہو' اس سے غلطی سرزرد ہو رہی ہو اور یہ الفاظ سن کر وہ فوراً چونک جائے' اپنے گریباں میں جھانکے اور اپنا محاسبہ کرے کہ کہیں ان الفاظ کا مصداق میں تو نہیں بن رہا۔ لہٰذا اس قسم کی آیات و احادیث کا ترجمہ کرتے وقت ان کے الفاظ پر قائم رہنا چاہئے' البتہ حاشیہ میں یا کسی مناسب جگہ پر وضاحت کر دی جائے کہ یہاں ایمان کی نفی ہو رہی ہے' اسلام کی نفی نہیں ہو رہی ـــــ اس مضمون کو ہم آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے' لیکن یہاں صرف ایک مثال دیکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُہٗ جَھَنَّمُ خَالِدًا فِیْھَا وَغَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَلَعَنَہٗ وَاَعَدَّ لَہٗ عَذَابًا عَظِیْمًا۝ ﴾ (النساء : ۹۳)

"اور جو شخص کسی مؤمن کو جان بوجھ کر قتل کرے (۱) اس کا بدلہ جہنم ہے (۲) وہ اس میں ہمیشہ رہے گا (۳) اللہ کا غضب اس پر ہے (۴) اور اللہ کی لعنت اس پر ہے (۵) اور اللہ نے اس کے لئے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے"۔

اس آیت کو پڑھ کر ہوش ٹھکانے آجاتے ہیں جس طرح کہ مذکورۃ الصدر حدیث میں وارد الفاظ : وَاللّٰہِ لاَ یُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰہِ لاَ یُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰہِ لاَ یُؤْمِنُ کو سن کر انسان کانپ اٹھتا ہے۔ ذرا غور کریں کہ ڈرانے' دھمکانے' ترہیب اور لرزانے کے جس قدر اسلوب ممکن تھے سارے کے سارے اس آیت میں جمع ہو گئے ہیں۔

الفاظ پر دوبارہ غور فرمائیں : فَجَزَاۤءُهٗ جَهَنَّمُ (اس کا بدلہ جہنم ہے) خَالِدًا فِيْهَا (وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہے گا) وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ (اور اس پر اللہ کا غضب ہے) وَلَعَنَهٗ (اور اس پر اللہ کی لعنت ہے) وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (اور اس کے لئے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے)۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع [(۱۸)] نے آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے بریکٹ میں اضافہ کر کے جو عبارت بنائی ہے وہ کچھ یوں ہے :

> "اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی (اصلی) سزا (تو) جہنم (میں اس طرح رہنا) ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔ (لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ اصلی سزا جاری نہ ہو گی' بلکہ ایمان کی برکت سے آخر نجات ہو جائے گی) اور اس پر (ایک میعاد معین تک کے واسطے) اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے' اور اس کو اپنی رحمت (خاصہ) سے دور کریں گے اور اس کے لئے بڑی سزا (یعنی سزاءِ دوزخ) کا سامان کریں گے۔"

ذرا غور کریں کہ فقیہانہ احتیاط کی وجہ سے مذکورہ آیت میں جو اسلوبِ ترجمانی اختیار کیا گیا ہے اس کو پڑھ کر کسی کے دل میں ذرا خوف' گھبراہٹ یا چنتا پیدا ہو گی؟ اس پر لرزہ طاری ہو گا؟ ـــــ میرا موقف یہ ہے کہ فتوے کے اعتبار سے حضرت مفتی صاحب کا موقف صد فی صد درست ہے۔ اگر دل میں ایمان ہے تو واقعتاً جہنم میں خلود (ہیشگی) نہیں ہو گا' وہ سزا پا کر بالآخر نکل آئے گا۔ اس مسئلے کو علیحدہ کتابچے کی شکل میں شائع کر کے لوگوں میں عام کر دیا جائے' البتہ اس آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ سارے اضافے کر کے اس کی تاثیر کو ختم نہ کیا جائے۔

بزرگوں کے اعتراضات اور میرا موقف

"راہ نجات سورۃ العصر کی روشنی میں" میرا معروف کتابچہ ہے۔ ہمارے شہر

---

(۱۸) جناب مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کا میں بہت احترام کرتا ہوں۔ آپ کی فقاہت' تدین' تقویٰ سب کچھ مسلم ہے۔ میں ان کے قریب رہا ہوں' کچھ عرصہ تک کورنگی میں ان کے دار العلوم کے قریب میری رہائش رہی ہے' گھریلو مراسم بھی تھے' بہت شفقت فرماتے تھے۔ (ماخوذ)

کے معروف مفتی مولانا جمیل احمد تھانوی صاحب نے میری اس تحریر پر ستر کے قریب اعتراضات وارد کر دیئے۔ ان کا فرمان تھا کہ میری اس تحریر سے تو ایمان ہی کی نفی ہو جاتی ہے۔ میں نے جناب کی بات کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ اس کے بعد میرا یہی کتابچہ 'جو صدیقی ٹرسٹ کراچی نے شائع کیا تھا اور اس میں کتابت کی بھی بے شمار غلطیاں تھیں' کسی نے مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کے اواخر عمر میں نشان زد کر کے پیش کر دیا۔ اسے دیکھ کر مولانا مرحوم نے فرمایا کہ یہ موقف صحیح نہیں ہے۔ چنانچہ اس وقت سے میں نے اس کتابچے کے کور پر درج ذیل تحریر کی اشاعت کا اہتمام کیا کہ :

"اس کتابچے پر بعض بزرگوں نے گرفت فرمائی ہے کہ اس کی بعض عبارات سے عاصی اور گناہ گار اہل ایمان کے اپنے گناہوں کے بقدر سزا پانے کے بعد جہنم سے رہائی پانے کی نفی ہوتی ہے۔ میں اس سے براءت کرتا ہوں۔ میری رائے بھی یہی ہے کہ جس مسلمان کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو گا وہ بالآخر جہنم سے نجات پا جائے گا۔ اس کتابچے میں جہاں جہاں لفظ نجات آیا ہے اس سے مراد "اول مرحلے میں نجات" ہے۔ یعنی یہ کہ انسان کو جہنم میں بالکل ڈالا ہی نہ جائے اور میدان حشر ہی میں رحمت و مغفرت خداوندی اس پر سایہ فگن ہو جائے ـــــ مزید برآں اس کتابچے کی زبان قانون اور فتوے کی نہیں بلکہ ترغیب و ترہیب کی ہے ـــــ ورنہ میرا موقف بھی وہی ہے جو امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کا ـــــ یعنی گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے بھی کوئی شخص کافر نہیں ہوتا بلکہ مسلمان ہی رہتا ہے!"

اشکالات کا آسان حل

اہل سنت کے موقف کی عام فہم تعبیر کیا ہے؟ اس کے لئے چار نکات پر غور کر لیں تو بات واضح ہو جائے گی۔

ا۔ ایمانِ مطلوب :

تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ایمان مطلوب کے دو اہم حصے ہیں۔

۲۔ قانونی ایمان :

ظاہری، خارجی اور قانونی ایمان کا دارومدار قول پر ہے اور یہی دنیا میں معتبر ہے۔ اس درجے میں عمل ایک جداگانہ وجود بن جاتا ہے۔ الایہ کہ کوئی انسان ایسا عمل کرے جو کھلم کھلا کفر یا شرک کا درجہ رکھتا ہو [۱۹] ورنہ عام کبائر کا معاملہ علیحدہ رہے گا۔ اس طرح عمل علیحدہ رہے گا اور ایمان علیحدہ رہے گا ـــــ اور اسی ظاہری و قانونی شکل کا نام اسلام [۲۰] ہے جس کا سب سے بڑا رکن زبان سے شہادتین کا اقرار کرنا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے :

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ : شَھَادَۃِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ، وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ، وَحَجِّ الْبَیْتِ وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) [۲۱]

"اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے : (۱) لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی گواہی دینا (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ ادا کرنا (۴) بیت اللہ کا حج کرنا (قرآن و حدیث میں استطاعت کی شرط کے ساتھ ہے۔) اور (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔"

۳۔ حقیقی ایمان :

حقیقی ایمان قلبی ایمان ہے۔ آخرت میں حساب کتاب اور فیصلوں کا دارومدار

---

(۱۹) اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔

(۲۰) ذرا غور کریں کہ اسلام صرف اقرار کا نام نہیں بلکہ حدیث میں موجود پانچ اعمال کے مجموعے کا نام ہے۔ پھر اسلام کے نام پر اعمال کو ایمان سے علیحدہ کرنے کا کیا بہر؟ اس فکر کا نتیجہ ہے کہ ہر کلمہ گو اپنے آپ کو مکمل مسلمان بلکہ کامل مؤمن سمجھ کر عمل سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ (اضافہ از مرتب)

(۲۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب ۱، ح ۸۔ و صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ارکان الاسلام، ح ۱۶

اسی حقیقی ایمان پر ہے۔ اس مرحلے پر اعمال صالحہ ایمان کا جزو بن جاتے ہیں کیونکہ یقین موجود ہو اور عمل موجود نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ اس موضوع کو مزید تفصیل اور دلیل سے دیکھنے کے لئے میرا معروف کتابچہ : "راہِ نجات سورۃ العصر کی روشنی میں" ضرور مطالعہ فرمالیں۔

۴۔ کمال ایمان :

کمال ایمان کے لئے اسلام کے بعد ایمان اور پھر درجہ احسان مطلوب ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء میں فرمایا :

﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا۝ ﴾

(النساء : ۱۳۶)

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر' اور اس کے رسول پر' اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے نازل فرمائی' اور جو شخص کفر کرے اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور آخرت کے دن کے ساتھ تو وہ شخص بہت دور کی گمراہی میں نکل گیا۔"

آیت مذکورہ میں خطاب مؤمنوں سے ہے اور انہیں کہا جا رہا ہے کہ ایمان لاؤ۔ مثلاً ایک شخص ہندو' عیسائی یا پارسی تھا' اس نے جونہی کلمہ پڑھا وہ قانوناً مسلمان ہو گیا۔ ایسے شخص سے کہا جا رہا ہے اس پر اکتفا نہ کرو' اصل ایمان تو تب ہو گا جب یہ دل میں داخل ہو گا۔ اس اصل ایمان کو حاصل کرنے کی فکر کرو' اور یہی آخرت میں کام آئے گا۔ آگے چل کر سورۃ المائدۃ میں فرمایا :

﴿ لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُم اتَّقَوْا

وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾ (المائدۃ : ۹۳)
"نہیں ہے ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کوئی گناہ یا حرج اس چیز میں جو انہوں نے کھایا یا پیا جبکہ انہوں نے تقویٰ اختیار کیا' پھر اور ایمان لے آئے پھر اور تقویٰ اختیار کیا' پھر اور ایمان لے آئے اور تقویٰ اختیار کیا' پھر وہ درجہ احسان پر فائز ہو گئے' اور اللہ تعالیٰ محسنین کو پسند فرماتا ہے"۔ [(۲۲)]

سورۃ النساء آیت ۱۳۶ میں فرمایا گیا تھا :

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ ﴾

معلوم ہوا ایمان کے دو درجے ہیں' پہلے درجے میں عمل صالح علیحدہ شے ہے۔ دوسرے درجے میں (یعنی قلبی ایمان والے درجے میں) عمل ایمان کا جزو بن گیا۔ لہٰذا آیت میں لفظ "عمل" کی تکرار نہیں کی گئی۔

نوٹ : یہاں یہ بات نوٹ کر لیں کہ عمل صالح جن لوگوں کے ایمان کا جزو بن چکا اور پھر انہوں نے مزید تقویٰ اختیار کیا تو اس طرح وہ لوگ درجہ احسان تک پہنچ گئے۔

حدیث جبریلؑ میں اسلام' ایمان اور احسان کا فرق واضح کیا گیا ہے اور یہ حدیث اُم السُّنۃ کہلاتی ہے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں ہے اور حضرات عمر' عبداللہ بن عمر' عبداللہ بن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

---

(۲۲) اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جب شراب کی حرمت کا آخری حکم آیا تو بہت سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تشویش لاحق ہو گئی کہ ہم تو عرصے سے شراب پیے جا رہے ہیں' شراب تو ہمارے وجود میں رچ بس گئی ہے' تو اب ہمارا کیا بنے گا؟ اس تشویش کو ختم کرنے کے لئے یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تاکہ اہل ایمان کو اطمینان خاطر حاصل ہو جائے اور ساتھ ہی آیت کے دوسرے حصے میں ایمان' عمل صالح اور احسان کے باہمی ربط و تعلق کو واضح کر دیا۔ (ماخوذ)

اسلام :

حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا[۲۳] اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ (مجھے اسلام کے متعلق بتلائیں) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا))

''اسلام یہ ہے کہ تم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت دو (یہاں شہادت کا لفظ ہے ایمان کا نہیں) نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو' رمضان کے روزے رکھو اور اگر (جانی و مالی) استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔''

نوٹ کرلیں کہ اس عبارت میں ایمان کا لفظ استعمال نہیں ہوا کیونکہ یہاں یقین والی بات نہیں ہے بلکہ ظاہری اطاعت والی بات ہے۔

ایمان :

جبریل علیہ السلام نے دریافت کیا : اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ (مجھے ایمان کے متعلق بتلائیں) آپ ﷺ نے فرمایا :

((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ))

''یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر' اس کے فرشتوں پر' اس کی کتابوں پر' اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر' اور یہ کہ تم ایمان لاؤ اچھی بری تقدیر پر۔''

---

(۲۳) صحیح بخاری' کتاب الایمان' باب۳۶' ح۵۰۔ و صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب۱' ح۹' مختلف سندوں کے ساتھ (بروایت ابوہریرہ) و صحیح مسلم' ح ۸ (بروایت عمرؓ) باقی صحابہ کی روایات دیگر کتب حدیث میں موجود ہیں' ملاحظہ ہو جمع الفوائد ج۱' ص۹ اور بعد

احسان :

حضرت جبریل علیہ السلام نے دریافت کیا : اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ (مجھے احسان کے بارے میں بتلائیں) آپ ﷺ نے فرمایا :

((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) (۲۴)

"(احسان یہ ہے) کہ تم اللہ کی عبادت اس کیفیت کے ساتھ کرو گویا کہ تم بچشم خود اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر خود دیکھنے والی کیفیت پیدا نہیں ہوتی (تو کم از کم یہ کیفیت ضرور ہو کہ) اللہ تو تم کو دیکھ رہا ہے"۔

جب ایمان کی کیفیت اس شدت کو پہنچ جائے تو وہ احسان بن جاتا ہے۔

زیر نظر حدیث جبریل علیہ السلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ تین درجے ہیں :

اسلام ــــ ایمان ــــ احسان۔

اور سورۃ المائدہ کی آیت ۹۳ کے مطالعے سے ہم معلوم کر چکے ہیں کہ ایمان' پھر ایمان' پھر احسان۔ تو معلوم ہوا کہ پہلے ایمان سے مراد اسلام ہی ہے۔ یعنی قانونی ایمان' پھر حقیقی ایمان' پھر گہرا اور راسخ ایمان یعنی احسان۔ اس موضوع کو مزید تفصیل بلکہ گہرائی سے جاننے کے لئے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ سے واضح راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ فرمایا :

﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ ﴾

---

(۲۴) اس حدیث کی مختلف روایات میں کچھ دوسرے الفاظ روایت ہوئے ہیں' انہیں بھی سمجھ لینا چاہئے۔ قَالَ : اَنْ تَخْشَی اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ... الخ (صحیح مسلم ح ۱۰' عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ) "یہ کہ تم اللہ سے اس طرح ڈرو جیسے کہ خود اسے دیکھ رہے ہو" دوسری روایت میں ہے: "اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ كَاَنَّكَ تَرَاهُ" (مجمع الزوائد ۱/۱۹۱ ح ۱۱۲' بروایت عبداللہ بن عباس) "یہ کہ تم اللہ کی خاطر کام کرو تو اس طرح کرو جیسے کہ تم خود اسے دیکھ رہے ہو"۔

"یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ اے نبی ان سے کہہ دیجئے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یا ہم نے اطاعت قبول کرلی ہے) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ البتہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا' بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے"

انہی حقائق کی روشنی میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "الایمان" میں ایک فصل کا نام ہی ان الفاظ میں تجویز کیا ہے "وقد اثبت اللّٰہ فی القرآن اسلامًا بلا ایمان" اور سورۃ الحجرات کی محولہ بالا آیت بطور دلیل پیش کی ہے۔ سابقہ دلائل کی روشنی میں نتیجہ یہ نکلا کہ ظاہری اور قانونی ایمان کا نام اسلام ہے ___ دل کی گہرائی اور تصدیق بلا ریب سے حاصل ہونے والا ایمان "حقیقی ایمان" ہے ___ اور ایمان کی گہرائی اور شدت جو ہر آن انسان کے اعمال پر اثر انداز ہو کر خشیت الٰہی کا مظہر بنے وہ کامل و مکمل ایمان یا بالفاظ دیگر احسان ہے۔

غلطی....اعتراف....اصلاح

ایمان کی تعریف کے ضمن میں مجھ سے کئی موقعوں پر ایک غلطی سرزد ہوئی ہے جس کا میں برملا اعتراف کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرے حوالے سے غلط بات نقل نہ کی جائے۔ ہوا یوں کہ میں نے امام ابو حنیفہ اور امام بخاری رحمہما اللہ کے موقف کا آپس میں تقابل کرتے ہوئے کہا کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک : "الایمان قولٌ" ہے اور امام بخاری کے نزدیک : "الایمان قولٌ وعملٌ" ہے۔ اس پر ماہنامہ "بینات" کراچی میں گرفت کی گئی کہ میں نے امام ابو حنیفہ کے موقف کو صحیح بیان نہیں کیا' کیونکہ امام موصوف کے نزدیک ایمان کی صحیح اور مکمل تعریف یہ ہے : ___ "الایمان تصدیقٌ واقرارٌ" ___ میں اس غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی اصلاح کرتا ہوں اور جن حضرات نے میری تقریر یا تحریر میں یہ غلطی پائی ہو وہ بھی اصلاح فرمالیں۔

ایک وضاحت

اپنی غلطی کا برملا اعتراف اور اعلانِ اصلاح کے بعد ایک بات کی طرف توجہ مبذول کروانا ضروری سمجھتا ہوں کہ :

(۱) تصدیق قلبی دنیا میں ہماری تفتیش کا موضوع بن ہی نہیں سکتی کیونکہ اس کا فیصلہ تو آخرت میں ہو گا۔ چنانچہ دنیا کے اعتبار سے تو زیر غور قول یا اقرار ہی باقی رہ گیا۔

(۲) جب امام ابو حنیفہ اور امام بخاری رحمہما اللہ کی آراء کے درمیان تقابل ہو رہا ہو تو گفتگو باعث اختلاف نکتے پر ہو گی۔ اور اختلاف تصدیق پر نہیں ہے' بلکہ امام ابو حنیفہ صرف قول کو کافی قرار دیتے ہیں جبکہ امام بخاری و دیگر محدثین قول پر عمل کا اضافہ بھی کرتے ہیں۔

اس اعتبار سے برائے تقابل ہماری بات غلط نہ تھی ـــــ اس کے باوجود میں نے اپنی لفظی غلطی کا اعتراف کر کے اصلاح کا اعلان کیا ہے۔

بابِ پنجم

ایمان و عمل کا باہمی تعلق

ایمان اور عمل کا باہمی تعلق کیا ہے؟ کیا ایمان و عمل کے درمیان لازم و ملزوم کا رشتہ ہے؟ آیا عمل ایمان کا جزو ہے یا اضافی چیز ہے؟ آیا گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے انسان صرف ایمان سے نکلتا ہے یا ایمان و اسلام دونوں سے نکل کر کفر میں داخل ہو جاتا ہے؟ آیا گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے انسان کے ایمان و اسلام پر کوئی اثر نہیں پڑتا یا کم و بیش کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے؟ ان سوالات کا جواب ہم بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں آٹھ مسلکوں کے موقف اور دلائل کو ایک نظر دوبارہ دیکھ لیں۔

ایک اصولی قاعدہ

قرآن حکیم کا شروع سے آخر تک اہتمام سے بغور مطالعہ کر لیں تو شاذ[1] ہی کوئی مقام نظر آئے گا کہ جہاں ایمان کے ساتھ عمل صالح[2] کا تذکرہ نہ ہو۔ اکثر و بیشتر "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ سورۃ العصر غالباً سب سے چھوٹی سورۃ ہے' اس میں بھی نہ صرف ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر ہے بلکہ اس کی مزید دو شاخوں کا بھی تذکرہ ہے۔ درحقیقت "تواصی بالحق و تواصی بالصبر" عمل صالح ہی کی دو شاخیں ہیں۔

---

(۱) استثناءات تو ضرور موجود ہیں اور جہاں بھی استثناء ہے اس کے لئے کوئی نہ کوئی قرینہ بھی موجود ہے۔ (ماخوذ)

(۲) قرآن حکیم میں ایمان کے ساتھ اجمالاً یا تفصیلاً عمل صالح کا ذکر ۸۷ بار آیا ہے۔ (اضافہ از مرتب ابو عبدالرحمٰن)

عربی زبان میں "واو" کے مختلف استعمالات ہیں، کہیں "واو" عطف کیلئے استعمال ہوتی ہے اور کہیں تفسیروبیان کے لئے لائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی "واو" کے متعدد استعمال ہیں۔ "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" میں "واو" کو اگر عطف کے لئے مان لیا جائے تو مغائرت کے معنی دے گی، یعنی ایمان اور چیز ہے اور عمل دوسری چیز، اور یہ دو علیحدہ حقائق (entities) ہیں لیکن اگر "واو" کو تفسیری قرار دے دیا جائے ("واو" کے مابعد والی عبارت ماقبل کی تفسیر بیان کر رہی ہے) تو پھر ان دونوں میں باہمی تلازم ثابت ہو جائے گا، جیسا کہ علامہ شبیر بخاری صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا تھا کہ علامہ فارابی اور دورِ حاضر کے مفکرین میں سے سید قطب شہیدؒ کی رائے یہ ہے کہ :

> "ایمان و عمل صالح کا باہمی تعلق یوں سمجھ لیں کہ ایک ایمان غیر مرئی ہے جو دل میں ہوتا ہے اور کسی کو نظر نہیں آتا اور ایک ایمان مرئی ہوتا ہے جو اعمال و کردار کی شکل میں نظر آتا ہے —— اور وہ ہے عمل صالح"۔

یہ تعبیر کا ایک انداز ہے۔ ایمان اور عمل صالح کے حوالے سے جو آٹھ مسلک بیان ہوئے تھے، ان کا خلاصہ ایک نظر دیکھ لیں تاکہ اگلی بات سمجھنی آسان ہو جائے :

خوارج : گناہ کبیرہ کا مرتکب ایمان و اسلام دونوں سے خارج ہو کر کافر ہو گیا، لہٰذا مرتد، واجب القتل، مباح الدم اور مباح المال ہے۔

معتزلہ : ایمان و اسلام سے خارج، البتہ کفر میں داخل نہیں ہوا، لہٰذا نہ مرتد، نہ واجب القتل اور نہ ہی مباح المال ہے۔

اہل تشیع : گناہ کبیرہ کا مرتکب ایمان سے خارج، البتہ مسلمان یا منافق۔ (۳)

---

(۳) اہل تشیع نے ایک زیادتی اور کی ہے کہ یہ فیصلے اسی دنیا میں کرنے شروع کر دیئے کہ فلاں مؤمن ہے، فلاں مسلمان ہے اور فلاں منافق ہے، حالانکہ ایمان اور نفاق کا صحیح فیصلہ تو قیامت کے روز ہی ہو سکتا ہے، اس دنیا میں ممکن ہی نہیں۔ اس سے بڑی جسارت انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کی ہے کہ چند ایک کو مؤمن قرار دے کر باقی غالب اکثریت کو یا مسلمان مانا یا پھر منافق قرار دے دیا ہے —— والعیاذ باللہ —— (ماخوذ)

محدثین : یعنی امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام بخاری اور عموم محدثین (رحمہم اللہ) کا موقف یہ ہے کہ عمل ایمان کا جزو لازم ہے، البتہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے انسان اسلام سے خارج نہیں ہوتا[۴] بلکہ کیفیت ایمان میں کمی آ جاتی ہے۔

احناف : سید الفقہاء امام ابو حنیفہ و دیگر ائمہ احناف (رحمہم اللہ) کے نزدیک عمل ایمان کا جزو نہیں ہے بلکہ یہ ایک علیحدہ حقیقت (entity) ہے۔ اور اس دنیا میں ایمان کا پیمانہ دعوائے تصدیق اور اقرار باللسان ہو گا۔

اشاعرہ : ان کے نزدیک ایمان صرف تصدیق کا نام ہے، اقرار بھی شرط نہیں، صرف اجراء احکام کے لئے "اقرار باللسان" ایک قانونی ضرورت ہے۔

مُرجیۂ : صرف اعتقاد کافی ہے اور مجرد اعتقاد ہی "نجات من النار" کا ضامن ہے۔

کرامیہ : اگر صرف زبانی کلمۂ توحید کا اقرار کر لیا تو بھی نجات کے لئے کافی ہے، دل میں تصدیق نام کی کوئی شے ہے ہی نہیں، لہٰذا اس سے کوئی بحث نہیں اور عمل بھی کسی درجے میں شرط نہیں۔

ہمارے معاشرے میں بے عملی و بد عملی کی بنیادی وجہ

ہمارے ہاں علماء کرام، فقہاء عظام اور مفتیان دین پر جب فقیہانہ اور مفتیانہ انداز غالب آ جاتا ہے تو قرآن حکیم اور احادیث رسول اللہ ﷺ میں جہاں جہاں انذار و ترہیب کا بیان آیا ہے جن میں بے عملی یا بد عملی کی وجہ سے ایمان کی نفی وارد ہوئی ہے یا جن مقامات پر "خلود فی النار" (آگ میں ہمیشہ رہنا) کی وعید آئی ہے، ان کی توجیہہ یا تشریح کرتے ہوئے ایسی ایسی شرطیں عائد کر دیتے ہیں جس کے

---

(۴) نماز کو چونکہ ایک خصوصی مقام حاصل ہے لہٰذا محدثین کی اکثریت کے نزدیک تارکِ نماز کافر ہے، دیگر گناہوں سے کفر لازم نہیں آتا، ملاحظہ ہو "نماز کی اہمیت" تالیف فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح العثیمین، ترجمہ ابو عبد الرحمٰن (اضافہ از مرتب)

نتیجے میں ترہیب وانذار کا اثر بالکل ختم ہو جاتا ہے' بلکہ پڑھنے والا بے عملی وبد عملی میں مزید جری وبے باک ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام کی عظیم اکثریت عملاً کرامیہ کے موقف پر کھڑی ہے کہ چونکہ ہم نے لاالٰہ الااللہ زبان سے پڑھ لیا ہے اور کلمۂ توحید کا اقرار نجات کے لئے بہت کافی ہے اور حدیث مبارک کے یہ آسان سے الفاظ سب کو ازبر ہیں "مَنْ قَالَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ"(۵) لہٰذا عمل کی ضرورت نہیں۔ اس پر اضافی رنگ "تصورِ شفاعت" نے چڑھایا ہے کہ ع کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں! لہٰذا شفاعت محمدیؐ سے بیڑا پار ہو ہی جائے گا۔

ان دو عقیدوں میں غلو کا نتیجہ ہے کہ امت بے عمل بلکہ بد عمل ہو کر رہ گئی۔ اس طرح ہمارے ہاں کے عوام کی عظیم اکثریت عملاً کرامیہ کے موقف پر پہنچ گئی ہے کہ بس لا الٰہ الااللہ پڑھ لیا اور باقی سارے دین سے آزادی۔ نہ فرائض وواجبات کی خبر ہے اور نہ حرام کی پروا۔ اس مقام سے جو لوگ ذرا آگے قدم بڑھاتے ہیں وہ بھی مُرجیۂ کے موقف پر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ بس اعتقاد کی حد تک تو ہر چیز مانتے ہیں لیکن عمل میں وہ بھی کورے ہیں ___ چنانچہ اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے صحیح موقف کو عوام کے سامنے پیش کریں' اس کے لوازمات و متضمنات و مضمرات کو سامنے لائیں تاکہ عوام صحیح العقیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ دینی احکام واقدار کی پابندی کرنے والے بھی بن جائیں۔ ورنہ اگر صرف فقیہانہ ومفتیانہ انداز سے دین کو پیش کیا گیا تو انذار و ترہیب سے متعلق ساری وعیدیں بے معنی اور بے وزن ہو کر رہ جائیں گی۔

سورۃ النساء آیت ۹۳ کے ضمن میں 'جو وعید شدید پر مشتمل آیت ہے' تفصیلی گفتگو گزر چکی ہے۔ البتہ یہ بات تکرار کی مستحق ہے کہ اس آیت میں ترہیب وانذار کے پانچ اسلوب بیان کئے گئے ہیں جن سے آدمی لرز اٹھے گا۔ لیکن جب اس کی

---

(۵) کشف الاستار ۱/۱۱ ح ۷ و مسند احمد ۲۳۶/۵۔ علامہ الالبانی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے' ملاحظہ ہو سلسلة الاحادیث الصحیحہ ح ۲۳۵۵۔ "جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا جنت میں داخل ہو گیا"۔

ترجمانی کرتے ہوئے اس کے اندر ایسے الفاظ ذکر کیئے جائیں جو کہ خالصتاً مفتیانہ ضرورت ہوا کرتے ہیں تو آیت کا سارا اثر ختم ہو کر رہ جائے گا' پڑھنے والے پر نہ کوئی اثر ہو گا اور نہ وہ کیفیت طاری ہو گی جسے قرآن یوں بیان کرتا ہے :

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ ﴾

(النازعات : ۴۰)

"اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا۔"

اس کے برعکس رجاء و امید کا پہلو غالب ہو جائے گا اور یہی بے عملی بلکہ بد عملی کی بنیاد ہے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے قرآن حکیم کے ایک اور مقام پر غور فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ : ۸۰-۸۱)

"اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں آگ چھو ہی نہیں سکتی مگر گنتی کے چند دن۔ (اے نبی!) ان سے پوچھو: کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ جس کی وہ خلاف ورزی نہیں کرے گا یا تم اللہ کی طرف وہ بات منسوب کر رہے ہو جس کے لئے تمہارے پاس کوئی علم نہیں۔ کیوں نہیں' جو کوئی بھی بدی کمائے گا اور اس کا گناہ اس کا احاطہ کرلے گا تو وہ دوزخی ہے اور ہمیشہ ہی وہ دوزخ میں رہے گا"۔

پہلی آیت میں یہود کے غلط نظریئے کا تذکرہ کرنے اور اس کی پُر زور تردید کرنے کے بعد دوسری آیت میں ایک اصولی قاعدہ بیان کر دیا کہ بات حسب نسب کی نہیں بلکہ اعمال و کردار کی ہے' جو کوئی ایسا کرے گا ایسے انجام سے دوچار ہو گا۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت مذکورہ کو سیاق و سباق کے پس منظر میں صرف

یہود سے متعلق قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ اس آیت میں کفارِ یہود کا تذکرہ ہے اور الفاظ میں موجود اس کے عموم کو باقی نہیں رکھا۔ چنانچہ جب کوئی مسلمان اسے پڑھے گا تو انہیں یہودیوں سے متعلق باتیں سمجھتے ہوئے خود لرزہ براندام نہیں ہوگا۔

البتہ حضرت شیخ الہند مولانا سید محمود حسن شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ [٦] نے ترجمے میں عموم کو برقرار رکھا ہے' البتہ حاشیے میں "گناہ کسی کا احاطہ کرلے" کی تعبیر و تشریح میں لکھا ہے کہ :

"گناہ کسی کا احاطہ کرلے' اس کا یہ مطلب ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کرلے کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو' حتیٰ کہ دل میں ایمان و تسلیم باقی ہوگی تو بھی احاطۂ مذکور محقق نہ ہوگا۔ تو اب کافر ہی پر یہ صورت صادق آسکتی ہے"۔

ذرا غور کریں کہ اس طرح کی تفسیر و تشریح پڑھنے کے بعد کون مسلمان چونکے گا؟ اس آیت میں جو تاثیر اور لرزا دینے والا انداز ہے وہ سب تاویلات میں لپیٹ کر بے اثر کردیا گیا۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو ترجمے کے اندر بھی بریکٹ میں کچھ اضافے کئے ہیں جس سے اس کی نوعیت بدل جاتی ہے لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمے میں الفاظ قرآنی کے اندر موجود عموم کو اپنی اصل حالت پر رکھا ہے' البتہ حاشیے میں یہ رائے دی ہے کہ یہ مرحلہ حالت کفر کے اندر ہی ہو سکتا ہے ورنہ ممکن نہیں ہے۔

ایک رائے......ایک مشورہ

علیٰ وجہ البصیرۃ میری پختہ رائے یہ ہے کہ اس قسم کی آیات و احادیث کا ترجمہ لفظی مفہوم کے مطابق کردیا جائے تاکہ ان آیات و احادیث کے اندر موجود انذار اور ترہیب و وعید کی جو کیفیت ہے وہ اعصاب پر اپنے اثرات دکھائے اور پڑھنے

---

(٦) میری رائے میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد اعظم ہیں۔ اس صدی میں بہت سے لوگوں نے تجدید کی کوشش کی ہے لیکن ان سب میں عظیم ترین درجہ حضرت شیخ الہند کو حاصل ہے۔ اس قدر عظیم قدر و احترام کے باوجود میں اس مقام پر حضرت صاحب سے اختلاف کی جسارت کر رہا ہوں۔ (ماخوذ)

والا کانپ کانپ اٹھے۔ امت کی اصلاح احوال کا صرف یہی ذریعہ ہے' "اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى" کی مطلوبہ و محمودہ کیفیت تب ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

فتویٰ اور قانونی زبان کی ایک اپنی اہمیت ہوتی ہے' لہٰذا علیحدہ ایک فتویٰ کی شکل میں وضاحت کر دی جائے کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ کافر ہو گیا ہے اور اسلام سے نکل کر مرتد ہو گیا ہے' جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ : وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ـــــ وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ـــــ یہاں مراد حقیقی ایمان کی نفی ہے جس کا فیصلہ صرف اور صرف آخرت میں جا کر ہو گا' البتہ اس قانونی ایمان کی نفی نہیں ہے جس پر دنیا میں احکام لاگو ہوتے ہیں۔ یہ خالصتاً فتویٰ کی ضرورت ہے' اس کی وضاحت ہو جانی چاہئے۔ اس وضاحت کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ "بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ" کی کیفیت پیدا ہو گی جو کہ شرعاً مطلوب و محمود ہے۔ ایک طرف دل کانپ رہا ہے' خبر نہیں کہ حقیقی ایمان کی کیفیت کیا ہے؟ پتہ نہیں اللہ کے ہاں میرا ایمان قبول ہے بھی یا نہیں؟ میں تمام ارکانِ ایمان کو تسلیم کرتا ہوں' اعمال کے لئے بھی مقدور بھر کوشش کر رہا ہوں' مجھے یہ بھی یقین ہے کہ کبیرہ گناہوں کے ارتکاب سے کوئی مومن کافر نہیں ہو جاتا' بہرحال اللہ تعالیٰ کے حضور بہتر انجام کی امید ہے۔ ان دو کیفیات کی وجہ سے انسان میں ایک اعتدال پیدا ہو گا اور وہ خوف و امید کے درمیان رہے گا۔ ایک طرف سے ڈر بھی رہا ہو گا اور دوسری طرف سے پُرامید بھی رہے گا۔

شرعی اصطلاحات کی اہمیت

قرآنِ حکیم اور حدیثِ پاک میں کئی جگہ کبیرہ گناہ کے ارتکاب پر ایمان کی نفی وارد ہوئی ہے' تو کیا اس سے مراد حقیقی ایمان کی نفی ہے یا ظاہری و قانونی ایمان کی نفی مراد ہے؟ اس مسئلے کے حل کی آسان اور عام فہم صورت یہ ہے کہ ایمان کے

دونوں پہلوؤں کو علیحدہ علیحدہ سمجھ لیا جائے۔

☆ حقیقی، قلبی اور باطنی ایمان : جو اصل ایمان ہے' آخرت میں نجات کا دارو مدار اسی پر ہو گا۔ احادیث میں اور بالخصوص حدیث جبریل میں اسی کو "الایمان" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

☆ قانونی' زبانی اور ظاہری ایمان : دنیا میں اسی ایمان کا اعتبار ہے۔ احکام کا اجراء اسی ایمان کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ حدیث جبریل میں اس کو "الاسلام" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حدیث جبریل جو کہ ام السنہ بھی کہلاتی ہے' مکمل الفاظ' ترجمے اور تخریج کے ساتھ گزر چکی ہے اور اس سے پہلے سورۃ النساء آیت ۱۳۶ میں ایمان ظاہری و ایمان حقیقی اور ان کے درمیان باہمی ربط و تلازم کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے۔

حدیث جبریل کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جبریل امین علیہ السلام مجمع عام میں انسانی شکل میں تشریف لائے اور یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک کے آخری دنوں میں پیش آیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی آمد پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا : "فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ"۔ دوسری روایت میں ہے : "هٰذَا جِبْرِيْلُ جَاءَ لِيُعَلِّمَ النَّاسَ دِيْنَهُمْ"۔ ایک اور روایت میں ہے : "هٰذَا جِبْرِيْلُ اَرَادَ اَنْ تَعَلَّمُوْا اِذْ لَمْ تَسْئَلُوْا"(۷) اس انداز و اہتمام سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی انتہائی اہم اور خاص بات تھی جو امت کو اس شان سے بتانی مقصود تھی۔ اصل میں یہ ایمان کا مسئلہ تھا جو کہ انتہائی اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ اس بنیادی مسئلہ کا دوسرا اہم جزو یہ ہے کہ دنیا میں مسلمان یا مؤمن کس کو مانا اور سمجھا جائے؟ کیونکہ ظاہری اسلام کی بنیاد تو داخلی ایمان ہے اور وہ دل میں ہوتا ہے اور وہ دنیا میں جانچ پڑتال کے قابل (Verifiable) نہیں ہے' اسے ہم دیکھ نہیں

---

(۷) حدیث کے تینوں طرح کے الفاظ صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب ا' ح ۸' ۹' ۱۰ میں وارد ہیں۔

سکتے' اس کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً حکم نہیں لگا سکتے' کوئی مفتی یا قاضی اس کے بارے میں فیصلہ نہیں دے سکتا۔ اصولاً یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فلاں فلاں کام ایمان کے منافی ہیں' اس کے بعد کون صحیح و سچا مومن ہے اور کون نہیں ہے اس کا فیصلہ اس دنیا میں نہیں ہو سکتا' یہ سارے بھید آخرت میں جا کر کھلیں گے۔ تو گویا ہم کسی کے اسلام کا فیصلہ تو کرسکتے ہیں ایمان کا نہیں' کیونکہ "اسلام" ظاہری کیفیت کا نام ہے اور "ایمان" حقیقی و باطنی کی کیفیت کا نام ہے۔ لہٰذا گفتگو' تحریر و تقریر اور فتویٰ و قانونی فیصلے میں ان اصطلاحات کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔

شرعی اصطلاحات کا استعمال

قرآن حکیم میں لفظ "اسلام" کا استعمال بھی اس شان اور آن بان سے ہوا ہے کہ رشک آتا ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام' دونوں مل کر دعا کر رہے ہیں :

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ﴾

(البقرۃ : ۱۲۸)

"اے رب! ہم دونوں کو اپنا مطیع فرمان بنا اور ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم (مطیع و فرمانبردار) ہو"۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا :

﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ ﴾

(البقرۃ : ۱۳۱)

"جب اس کے رب نے اس سے کہا "مسلم ہو جا" تو اس نے فوراً کہا "میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا"۔

یہاں یہ قاعدہ ذہن میں رہے کہ قرآن حکیم اور حدیث رسول ﷺ میں "ایمان" اور "اسلام" کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر آئے ہیں۔ دینی اصطلاحات کے کئی جوڑے ہیں جن کے بارے میں اہل علم نے ایک اصول وضع

کیا ہے : "اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اجْتَمَعَا" یعنی ان کا اگر علیحدہ علیحدہ تذکرہ ہو گا تو ایک ہی معنی میں لئے جائیں گے اور اگر ایک ہی جگہ پر ذکر آئے گا تو ان کے معنی میں فرق ہو گا۔ نوٹ کیجئے اسلام کی داخلی کیفیت کا نام "ایمان" ہے اور ایمان کے خارجی مظہر کا نام "اسلام" ہے۔ درحقیقت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ انگریزی محاورے کے مطابق :

Call the rose by any name it will smell as sweet

آپ گلاب کے پھول کو کوئی نام دے دیں اس کی خوشبو وہی رہے گی۔ جس شخص کے دل میں ایمان ہے' عمل میں اسلام ہے' اسے آپ مومن کہہ لیں' مسلم کہہ لیں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ البتہ اس قسم کے الفاظ جہاں ایک جگہ آ رہے ہوں اور ایک دوسرے کے تقابل میں آ رہے ہوں وہاں مفہوم معین کرنا پڑتا ہے۔ سورۃ الحجرات آیت ۱۴ اس فرق کو خوب خوب واضح کر رہی ہے' فرمایا :

﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

"یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ اے نبی فرما دیجئے تم ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو ہم اسلام لے آئے ہیں (یا ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ غفور اور رحیم ہے"۔

☆ یہ بدو کون تھے؟ ـــــ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر متعدد مفسرین کا قول ہے کہ ان بدوؤں سے مراد منافقین ہیں۔ کیونکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ ان کے پاس اسلام تو ہے' البتہ دلوں میں ایمان نہیں اور یہ تو نفاق ہی کی شکل ہے۔ بظاہر یہ رائے اور دلیل خاصی مضبوط ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ لوگ نہ مؤمن تھے اور نہ منافق تھے بلکہ خلا میں

تھے۔ یہ رائے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ہے اور ان کے شاگرد علامہ ابن کثیر نے پیش کی ہے۔ میں بھی اسی رائے کو صحیح سمجھتا ہوں۔(۸)

اس خلا کی حقیقت سمجھنے کیلئے یوں سمجھئے کہ مسلمان کی تین حالتیں ممکن ہیں۔

☆ مثبت طور پر ایمان اور اس میں درجات کا اضافہ ۱+، ۲+، ۳+، ۴+ اور بالآخر infinity یعنی لامحدود ہو جائے گا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایمان infinity کے مقام پر چلا جائے گا۔

☆ منفی طور پر ایمان اور اس میں درکات (پستی کا اضافہ) ۱-، ۲-، ۳-، ۴- اور بالآخر infinity یعنی لامحدود ہو جائے گا۔ یہ نفاق کی کیفیت ہے، عبداللہ بن ابی کا نفاق infinity تک چلا جائے گا۔

---

(۸) اس حوالے سے ایک واقعہ دلچسپی کا موجب ہو گا۔ ۱۹۶۲ء کا واقعہ ہے، ساہیوال کی ایک مسجد میں، میں اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب معتکف تھے۔ صبح کے وقت سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ پر بات ہوئی۔ میں نے کہا اس آیت سے مراد منافق نہیں ہو سکتے، مولانا کے خیال میں اس سے مراد منافق ہی تھے، میں نے دلیل پیش کی کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا ﴾ جبکہ منافق کا کوئی عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا۔ پھر یہ کیسے منافق ہو سکتے ہیں؟ یہ ہرگز منافق نہیں تھے۔ ابھی یہ بحث و تمحیص جاری تھی کہ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ مولانا عبدالجلیل صاحب امام و خطیب جامع مسجد اہل حدیث نے امام ابن تیمیہؒ کی کتاب "الایمان" ہمیں اس پیغام کے ساتھ بھجوا دی کہ آپ لوگ حالت اعتکاف میں ہیں ذرا اس کو بھی دیکھ لیں۔ جونہی میں نے کتاب کھولی تو عین وہی صفحہ نکل آیا جس میں امام ابن تیمیہ نے یہ فصل قائم کی ہے: وقد اثبت اللّٰہ فی القرآن اسلاما بلا ایمان لقولہ تعالٰی : قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا...... ۔ "اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایسا اسلام ثابت کیا ہے جس کے ساتھ ایمان نہ ہو اور مذکورۃ الصدر آیت بطور دلیل پیش کی ہے"۔ اس پر مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے مجھے دعائیں دیں اور فرمایا کہ تم اگر باضابطہ دینی علوم حاصل کر لو تو بہت اچھا ہے، تمہارے ذہن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے ساتھ بڑی مناسبت دی ہے۔ میں نے عرض کیا پڑھا دیجئے میں تیار ہوں۔ (ماخوذ)

☆ ترقی ایمان اور پستی ایمان کے درمیان لامحالہ ایک ایسا مقام آئے گا جسے میں Zero لیول سے تعبیر کرتا ہوں۔ ریاضی میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ بس یہی Zero لیول خلا کی کیفیت ہے' نہ مثبت طور پر ایمان موجود ہے اور نہ منفی طور پر نفاق ہے' بلکہ ایک خلا ہے۔

فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کی دلی کیفیت

حضورِ اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے آخری دَور میں جبکہ اسلام کو جزیرہ نمائے عرب میں غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور پورے عرب میں ایک رو چل نکلی تھی کہ اب اسلام لے آؤ' اب مقابلے کا کوئی فائدہ نہیں' اب مزاحمت کی صورت میں کامیابی کی کوئی امید نہیں' اب محمد کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور محمد (ﷺ) کا راستہ نہیں روک سکتے۔ اس لہر کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا : ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ○ ﴾ "(اے نبی) جب اللہ کی مدد آ پہنچی اور (مکہ) فتح ہو گیا اور آپ نے (لوگوں کو) دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں"۔ کہاں حضور اکرم ﷺ مکی دور میں ایک ایک فرد کے لئے جھولی پھیلا کر دعائیں مانگتے تھے : اے اللہ! عمر بن الخطاب یا عمرو بن ہشام (ابوجہل) میں سے کسی ایک کو میری جھولی میں ڈال دے تاکہ اسلام کو تقویت حاصل ہو۔ کہاں یہ صورت حال ہے کہ فوج در فوج اور قبیلے کے قبیلے اسلام میں داخل ہونے لگے ہیں۔ اس وقت اسلام لانے والوں کی دلی کیفیت کو مندرجہ ذیل ممکنہ صورتوں میں رکھا جا سکتا ہے۔

☆ ان میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو پہلے ہی دل میں ایمان لا چکے ہوں' لیکن قبیلے کے خوف سے ابھی تک اسلام ظاہر نہ کیا ہو۔

☆ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو اس وقت صدق دل سے ایمان لائے ہوں' فی الواقع ایمان ان کے دل میں داخل ہو گیا ہو۔ بہر حال سب بدو ایک جیسے نہیں تھے' اسی

لئے ہم نے ترجمہ "یہ بدو کہتے ہیں" کیا ہے' کیونکہ سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا ہے کہ ان میں مؤمنین صادقین بھی ہیں۔

☆ یہ صورت بھی ممکن ہے کہ ان اسلام لانے والوں میں ایسے لوگ بھی شامل ہوں جو کہتے ہوں کہ ٹھیک ہے اب تو اور کوئی چارہ کار نہیں ہے' اس وقت گردن جھکا دو' بعد میں کسی اور طریقے سے نمٹ لیں گے۔ یعنی بظاہر اسلام کا روپ' اندر نفاق کا کھوٹ۔

☆ نہ تو مثبت طور پر ایمان موجود ہے اور نہ منفی طور پر نفاق پر مبنی بدنیتی' اور نہ ہی دھوکہ دینے کا ارادہ ہے' بلکہ زمانے کی چال کے ساتھ چل رہے ہیں۔ یہ ہے وہ خلا کی کیفیت' یعنی زیر دلیول کہ ابھی تک دل میں ایمان بھی داخل نہیں ہوا لیکن ارادے میں کوئی بدنیتی بھی نہیں ہے' اس لئے اسے نفاق بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ایک رعایت اور بشارت

سورۃ الحجرات آیت ۱۴ میں فرمایا گیا ہے کہ : "اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ تمہارے اعمال میں کوئی کمی نہیں کرے گا"۔

یہ جملہ ہمارے لئے بہت بڑی بشارت اور خوشخبری ہے۔ اس لئے کہ اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو ہم میں سے اکثریت کی حالت ایسی ہی ہے۔ اس وقت ایمان کی ہوا چلی تھی اور لوگ روا روی میں ایمان لے آئے۔ اب ایمان نسل در نسل وراثتاً منتقل ہو رہا ہے یہ ہمارا کوئی ارادی انتخاب (Choice) تو نہیں ہے' ہم نے اپنے فیصلے سے تو ایمان قبول نہیں کیا' بلکہ ایمان وراثتاً چلا آ رہا ہے اور ہم حادثاتِ زمانہ کے تحت اس کے دعویدار ہیں۔ البتہ خدانخواستہ نفاق بھی دلوں میں نہیں ہے (الاّ یہ کہ کسی کے دل میں یہ مرض موجود ہو تو اور بات ہے)۔ اکثر و بیشتر لوگ منافق نہیں اور بالارادہ وہ مؤمن بھی نہیں ہیں۔ آیت مذکورہ پر غور سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حال

میں بھی لوگ اطاعت کرتے رہیں گے تو اللہ تعالیٰ اس اطاعت کو قبول فرمالیں گے۔ اس پہلو سے یہ بہت بڑی بشارت ہے۔

قانون تو یہ ہونا چاہئے کہ ایمان کے بغیر کوئی اطاعت قبول نہ ہو لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے رعایت برتی ہے اور اس آیت کو "اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ" پر ختم کیا ہے۔ گویا یہ اس کی شانِ غفاری کا صدقہ ہے یا اس کی شانِ رحیمی کا مظہر ہے کہ تمہارے ساتھ یہ رعایت کی جارہی ہے کہ اگرچہ ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اس کے باوجود اگر تم اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری اطاعت قبول فرمالے گا۔

دو اصولی باتیں

یہاں دو اصولی باتیں نوٹ کرلیں۔ سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ خلا کی کیفیت (زیرو لیول والی کیفیت) یعنی نہ مثبت سمت میں ایمان اور نہ منفی سمت میں نفاق' یہ حالت مستقل نہیں رہ سکتی ؎

ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں
سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں

لہٰذا آدمی یا تو ایمان کی طرف پیش قدمی کرے گا یا نفاق کی طرف لڑھکے گا اور دونوں طرف جانے کے اپنے اپنے اسباب و عوامل ہوا کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ سورۃ الحجرات آیت ۱۴ میں جہاں عظیم خوشخبری موجود ہے اس کے ساتھ ایک انذار و وعید بھی جمع کرلیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اطاعت سے مراد اطاعت کلی ہے' جزوی یا اختیاری اطاعت' اطاعت شمار نہیں ہوتی بلکہ الٹا دنیا و آخرت میں قابل سزا جرم بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴾

(البقرۃ : ۸۵)

"تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیئے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو"۔

البتہ بھول چوک، غلطی، نسیان، گناہ صغیرہ، گناہ کبیرہ یا اکبر الکبائر میں سے کسی گناہ کا کسی وقت سرزد ہو جانا اور بات ہے۔ وہ اصول زندگی نہیں ہوا کرتا بلکہ فریب نفس یا وسوسۂ شیطان کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس صورت میں توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ ﴾ (النساء : ١٧)

"ہاں یہ جان لو کہ اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہی لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے، پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے"۔

لہٰذا غلط اصولِ زندگی اور اتفاقی غلطی کے درمیان واضح فرق رہنا چاہیۓ اور معاملات کا تجزیہ کرتے ہوئے یا مستقبل کے بارے میں غور کرتے ہوئے اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیۓ۔ کیونکہ غلط اصولِ زندگی ضلالت ہے اور ہر قسم کی غلطی، چھوٹا یا بڑا گناہ بشری کمزوری ہے، اور ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

ایمان میں کمی بیشی یا جمود؟

رئیس المحدثین امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : "اَلْاِيْمَانُ قَوْلٌ وَّعَمَلٌ يَزِيْدُ بِالطَّاعَةِ وَيَنْقُصُ بِالْمَعْصِيَةِ" یعنی ایمان قول و عمل کا نام ہے جو کہ اطاعت سے بڑھتا ہے اور گناہ کرنے سے کم ہوتا ہے۔

سید الفقہاء امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں : "اَلْاِیْمَانُ تَصْدِیْقٌ بِالْجَنَانِ وَاِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ" یعنی دل سے تصدیق کرنے اور زبان سے اقرار کرنے کا نام ایمان ہے' جو نہ بڑھتا ہے اور نہ کم ہوتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے موقف کی مندرجہ ذیل آیات تائید کرتی ہیں :

﴿ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۝ ﴾

(آل عمران : ۱۷۳)

"(جن سے لوگوں نے کہا : تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہو گئی ہیں ان سے ڈرو) تو (یہ سن کر) ان کا ایمان اور بڑھ گیا' اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے"۔

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۝ ﴾

(الانفال : ۲)

"سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔"

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا۝ ﴾ (الاحزاب : ۲۲)

"اور سچے مؤمنوں (کا حال اس وقت یہ تھا کہ انہوں) نے جب حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ "یہی وہ چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی"۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور سپردگی کو اور زیادہ بڑھا دیا۔"

﴿ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ اَیُّکُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖ اِیْمَانًا ج فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ۝

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُوْنَO ﴾ (التوبة : ۱۲۴'۱۲۵)

"جب کوئی نئی سورة نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض لوگ (مذاق کے طور پر مسلمانوں سے) پوچھتے ہیں کہ "کہو تم میں سے کس کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوا؟" جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو فی الواقع (ہر نازل ہونے والی سورة نے) اضافہ ہی کیا ہے اور وہ اس سے دلشاد ہیں' البتہ جن لوگوں کے دلوں کو (نفاق کا) روگ لگا ہوا ہے ان کی سابق نجاست پر (ہر نئی سورة نے) ایک اور نجاست کا اضافہ کر دیا۔ اور وہ مرتے دم تک کفر ہی میں مبتلا رہے۔"

مذکورہ بالا آیات میں بصراحت اضافۂ ایمان کا تذکرہ آیا ہے۔ نیز کچھ احادیث میں ایمان میں کمی کا ذکر بھی وارد ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا :

((اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا اَذْنَبَ ذَنْبًا كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِيْ قَلْبِهٖ' فَاِنْ تَابَ وَنَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُهٗ فَاِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰى يَعْلُوَ قَلْبَهٗ فَذٰلِكَ الرَّانُ الَّذِيْ قَالَ جَلَّ ثَنَاءُهٗ : كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَO)) [9]

"جب مؤمن کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے' اگر توبہ استغفار کرلے اور گناہ سے باز آجائے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے' لیکن اگر گناہوں میں آگے بڑھتا چلا جائے تو یہ سیاہ دھبہ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے سارے دل کو کالا کر دیتا ہے اور یہی وہ "ران" (زنگ اور میل کچیل) ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے (سورة المطففین آیت ۱۴ میں) تذکرہ کیا ہے : "ہرگز نہیں بلکہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔"

---

(۹) مسند احمد ۲/۲۹۷ ح ۷۹۳۹۔ احمد شاکر نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔ سنن الترمذی' کتاب التفسیر' باب من تفسیر سورة ویل للمطففین۔ المستدرك للحاكم ۲/۵۱۷۔ امام حاکم' امام الذہبی' امام ترمذی نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ غلط اعمال کا انسانی کردار پر اثر سمجھنے کے لئے "کبیرہ گناہوں کی حقیقت" ص ۳۵ تا ص ۹۴ کا مطالعہ از حد مفید ثابت ہو گا۔

چونکہ گناہ دل پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایمان کو کمزور کرتے ہیں اس لئے علماء نے کہا ہے "المعاصی برید الکفر" کہ گناہ کفر کی ڈاک ہے' یعنی معصیت سے کفر کے پیغامات اور ہوائیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ چلتا رہے گا تو پہلے ایمان کمزور ہو گا اور بالآخر ختم ہو جائے گا۔ ظاہر ہے جب ایمان نہیں رہے گا تو کفر ڈیرے ڈال لے گا۔ اور یہی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے۔

البتہ سید الفقہاء [(۱۰)] امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایمان ـــــ بمعنی ایمانِ ظاہری یعنی اسلام ـــــ جامد ہے' نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے' اور اسی ایمان کے ذریعے انسان کو اسلامی معاشرے یا اسلامی ریاست میں قانونی (Legal) اور دستوری (Constitutional) مقام (Status) حاصل ہوتا ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے معاشرے میں اس کے حقوق متعین ہوتے ہیں۔ اسلامی ریاست میں اس کے حقوق سب مسلمانوں کے لئے برابر ہیں۔ قانونی طور پر سب مسلمان برابر ہیں لہٰذا قانونی سطح پر اسلام بالکل مساوی ہے۔

مثال : بالفرض اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا کامل الایمان اور عبد اللہ بن ابی جیسا آخری درجے کا منافق ایک ہی والد کے بیٹے ہوتے تو ان کو وراثت میں حصہ برابر ملتا' ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ایمان کی وجہ سے زیادہ نہ ملتا اور عبد اللہ بن ابی کو نفاق کی وجہ سے کم نہ ملتا۔ یہ محض ایمان کا قانونی پہلو ہے' حقیقی نہیں۔ عصر حاضر کی اصطلاحات کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریاست میں تمام مسلمان شہریوں کے حقوق برابر ہیں'

---

(۱۰) مجھ پر امام ابو حنیفہؒ کی عظمت یہاں منکشف ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں انہیں بار بار سید الفقہاء کہہ رہا ہوں اور دل کی گہرائی سے ان کی عظمت کا معترف ہوں۔ میرا یہ اذعان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو قانون و دستور کا جس قدر فہم دیا تھا میرے علم کی حد تک کسی کو نہیں دیا گیا' قانون اور دستور کا ایک خاص sense ہوتا ہے جسے حاصل کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ چونکہ آپ فقیہ تھے اس لئے آپ کی نگاہ معاملات کے قانونی پہلو پر رہتی تھی۔ (ماخوذ)

کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے : "اَلْمُسْلِمُ کُفُوٌ لِکُلِّ مُسْلِمٍ "[11] ہر مسلمان دوسرے کے برابر ہے۔ تمام مسلمانوں کے قانونی و دستوری حقوق (Legal and Constitutional Rights) برابر ہیں۔ یعنی ایمان کا قانونی پہلو جسے ہم اسلام سے تعبیر کرتے ہیں' اس سطح پر سب مسلمان برابر ہیں۔ البتہ حقیقی ایمان جو باطن میں ہے اس کے بارے میں کون کہہ سکتا ہے کہ وہ نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے' جبکہ قرآن حکیم میں متعدد صریح آیات پکار پکار کر اس کی شہادت دے رہی ہیں۔ ہر شخص کا ذاتی تجربہ شاہد ہے کہ ایمان گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے۔ قرآن حکیم کو سوچ سمجھ کر پڑھئے' ذکر کیجئے' اہل یقین کی صحبت میں بیٹھئے' خود بخود محسوس ہو گا کہ اندر کوئی احساس ترقی کر رہا ہے۔ اس کے بالمقابل غافلوں کی محفل میں بیٹھئے' ٹھٹھے لگایئے' فحش گوئی کیجئے' حرام خوری کیجئے' خود بخود محسوس ہو گا کہ اندر سے کوئی چیز برف کی طرح پگھل پگھل کر کم ہو رہی ہے۔

اس بحث سے معلوم ہوا کہ ایمان کا قانونی پہلو (جو کہ اسلام کہلاتا ہے) کم وبیش نہیں ہوتا۔ اس کے بالمقابل حقیقی ایمان' جو یقین قلبی سے عبارت ہے' کم وبیش ہوتا رہتا ہے اور ہر انسان پر دن میں کئی مرتبہ یہ کمی بیشی وارد ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے حقیقی ایمان کو سامنے رکھا اور فرمایا "اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَ عَمَلٌ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ" اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے قانونی ایمان کو سامنے رکھا اور فرمایا : "اَلْاِیْمَانُ تَصْدِیْقٌ وَّقَوْلٌ لَاَ یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ"۔ اس ظاہری تضاد اور بُعد المشرقین کے باوجود دونوں حضرات سو فیصد صحیح بات کہہ رہے ہیں۔ ایک حقیقی ایمان اور دوسرا قانونی ایمان کی بات کر رہا ہے۔ اس لئے کہ دونوں کے میدان' اصول اور نتائج جدا جدا ہیں۔

---

(11) اور اس قاعدے کی بنیاد آپ ﷺ کا یہ فرمان ہے : المسلمون یدٌ علٰی مَن سواھم تکافا دمائھم [مسند احمد ۲/۱۸۰۔ احمد شاکر نے حدیث کو صحیح کہا ہے' ملاحظہ ہو شرح احمد شاکر ح ۶۶۹۲] "تمام مسلمان کافروں کے مقابلے میں ایک طاقت ہیں اور ان کے آپس میں خون برابر ہیں" (اضافہ از مرتب)

ایمان اور جہاد

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ ﴾ (الحُجُرات : ۱۵)

”حقیقت میں مؤمن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا' وہی سچے لوگ ہیں۔“

سورۃ الحجرات آیت ۱۴ میں ایمان اور اسلام کو علیحدہ کر دینے کے بعد آیت ۱۵ میں ایمان کو واضح اور معین طور پر define کر دیا گیا۔ ذرا غور کریں کہ ابتداء میں ”اِنَّمَا“ (صرف وہ آدمی جس میں مطلوبہ خوبیاں پائی جائیں) اور آخر میں ”اُولٰٓئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ“ (صرف یہی لوگ سچے ہیں) کا اسلوبِ حصر لگا کر تعریف کو جامع و مانع کر دیا گیا

حصر کیا ہے؟ عام زبان میں ہم کہیں گے ”زید عالم ہے“ اس کا معنی یہ ہوا کہ زید ضرور عالم ہے لیکن دوسرے لوگ بھی عالم ہو سکتے ہیں۔ البتہ جب ہم کہیں : ”صرف زید ہی عالم ہے“ تو معلوم ہوا کہ زید عالم ہے اور دوسرا کوئی عالم نہیں ہے۔ اس طرح علم کی صفت صرف زید کے لئے ثابت ہوئی اور دوسروں سے اس کی نفی ہو گئی۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ مؤمن تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد یہ شرائط بھی پوری کریں :

۱۔ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا (دعوائے ایمان کے بعد کسی شک میں مبتلا نہ ہوں) یقین کی تعبیر کے لئے اس سے زیادہ خوبصورت اور کوئی لفظ ممکن نہ تھا' بلکہ اگر صرف مثبت یقین کا لفظ آتا تو یہ زور پیدا نہ ہوتا جو ”ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا“ کے الفاظ سے پیدا ہوا ہے۔

۲۔ وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (اور اپنے مالوں اور جانوں کو کھپا کر اللہ کی راہ میں جہاد کریں)۔

اس طرح ایمان حقیقی کے لئے دو شرطیں لازم قرار دے دی گئیں (دل میں غیر متزلزل یقین اور عمل میں مالی و جانی جہاد)۔ شروع کی طرح آخر میں پھر اسلوبِ حصر لایا گیا' فرمایا : "اُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ" صرف یہ شرطیں پوری کرنے والے افراد ہی اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔

جس طرح پرکار کے دو سرے بند ہو کر ایک نقطہ پر اکٹھے ہو جاتے ہیں اسی طرح اس آیت کریمہ میں دو چیزیں اکٹھی بیان کر دی گئیں۔ جبکہ سورۃ الانفال میں پرکار کے دونوں بازو کھول دیئے گئے۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں فرمایا :

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝ ﴾

(الانفال : ۲۔۴)

"سچے اہل ایمان تو بس وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مؤمن ہیں' ان کے لئے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں' خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے"۔

سورۃ الانفال کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْا اُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴾

(الانفال : ۷۴)

"جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جہاد کیا اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مؤمن ہیں' ان کے لئے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے"۔

سورۃ الحجرات میں جو پر کار بند تھی اس کو جب کھولا گیا تو ایک بازو سورۃ الانفال کے شروع میں آیا اور دوسرا آخر میں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ جہاد ایمانِ حقیقی کا رُکن لازم ہے۔ اور اسے یوں بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ جہاد ایمان کا لازمی نتیجہ ہے' اگر ایمانِ حقیقی موجود ہے تو جہاد لازماً ہو گا' کیونکہ سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ اسلام کی تعریف کے فوراً بعد آئی ہے اور پھر اوّل و آخر الفاظِ حصر کو لا کر واضح کر دیا گیا ہے کہ ایمان کی جامع و مانع تعریف یہی ہے کہ دل میں غیر متزلزل یقین اور عمل میں جان و مال سے جہاد۔

چونکہ ایمان حقیقی کے اثرات آخرت میں ظاہر ہوں گے لہٰذا اخروی نجات کے لئے جو بات بطور شرط اور لازمی اصول کے بیان کرنی تھی وہ سورۃ الصف کی اس آیت میں بیان کر دی گئی' فرمایا :

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(الصف : ۱۰-۱۱)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذابِ الیم سے بچا دے؟ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے' یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو"۔

ذرا غور کریں کہ جنت کا وعدہ یا داخلہ تو بعد کی چیز ہے پہلے عذاب سے چھٹکارا پانا ضروری ہے جس کے لئے دو لازمی شرطیں بیان کی گئی ہیں :

ا : اللہ اور اس کے رسول پر ایمان۔

ب : جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اسلام عام ہے اور ایمان خاص ہے۔ اسلام کے

پانچ ارکان ہیں : شہادتِ توحید و رسالت، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج۔ اب شہادت توحید و رسالت سے پہلے یقین قلبی اور حج کے بعد جہاد کا اضافہ کرلیں تو ایمان بن جاتا ہے۔

جوشِ جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر بعض لوگوں نے جہاد فی سبیل اللہ کو اسلام کا رکن قرار دے دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑی غلطی بلکہ جسارت ہے، کیونکہ حدیث جبریل میں اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی معروف روایت "بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ.....الخ" میں اسلام کے پانچ ہی ارکان بیان ہوئے ہیں۔ اتنی واضح نصوص کے ہوتے ہوئے ارکانِ اسلام میں جہاد یا کسی اور کام کا اضافہ کرنا اپنے آپ کو حکمت نبویؐ سے بالاتر ثابت کرنا ہے ــــــ والعیاذ باللّٰہ۔

جہاد کے بارے میں مغالطے اور وضاحتیں

جہاد کے بارے میں مسلمانوں کو چند در چند مغالطے لاحق ہیں۔ گویا ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ کے مصداق گمراہی پر گمراہی یا کم از کم غلطی پر غلطی کا معاملہ ضرور ہے۔

پہلا مغالطہ : پہلا مغالطہ بالعموم یہ ہے کہ جہاد کا معنی جنگ اور قتال ہے۔

وضاحت : اس مغالطے کی بنیاد ہی غلط ہے، اس لئے کہ جہاد اور قتال قرآن حکیم کی دو الگ اصطلاحیں ہیں۔ اگرچہ ان کا معاملہ بھی اسلام و ایمان کی طرح ہے کہ اگر ایک بیان ہو تو دوسرے کے معنی لئے جاسکتے ہیں اور اگر دونوں اکٹھے بیان ہوں تو ان کے علیحدہ علیحدہ معنی معین کرنے پڑتے ہیں، جیسا کہ قاعدہ گزرا ہے : "اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اجْتَمَعَا" یعنی جب وہ دونوں اکٹھے ہوں تو مفہوم علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے اور جب علیحدہ علیحدہ بیان ہوں تو معنی ایک ہی ہوتا ہے۔ البتہ جہاد کے معنی لازماً جنگ کے نہیں ہوتے۔ اسی غلطی اور مغالطے کی وجہ سے بہت ساری چیزیں ذہنوں میں الجھی ہوئی ہیں۔

دوسرا مغالطہ : جنگ تو ہر وقت نہیں ہوتی لہٰذا ہم کس طرح ہر وقت جہاد میں

شریک ہو سکتے ہیں۔

وضاحت : یہ مغالطہ بھی سابقہ مغالطے کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا ہے' ورنہ جنگ تو واقعتاً کبھی کبھی ہوتی ہے اور سلسلۂ جہاد ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

تیسرا مغالطہ : خاص حالات کے علاوہ تو جنگ فرض کفایہ ہے' للذا اگر مجاہدین کی اتنی تعداد میسر آ جائے کہ مطلوبہ ضرورت پوری ہو جائے تو باقی لوگوں پر کوئی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔

وضاحت : یہ مغالطہ بھی اس لئے پیدا ہوا کہ جنگ اور جہاد کو ایک ہی کام سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دونوں میں وسیع و عریض فرق ہے۔

چوتھا مغالطہ : مسلمان جب بھی جنگ کرتا ہے تو وہ جہاد فی سبیل اللہ شمار ہوتا ہے۔

وضاحت : ایک مسلمان' مسلمان ہونے کے باوجود ظالم و فاسق بھی ہو سکتا ہے۔ مسلمان اپنے غلبے اور اپنے ملک کی توسیع کے لئے بھی جنگ کرلیتا ہے۔ اس کا معنی یہ نہیں کہ یہ سارے غلط کام "جہاد فی سبیل اللہ" شمار ہوں۔ بلکہ یہ سارے کام فساد فی الارض کے زمرے میں آتے ہیں۔ صحیح اسلامی جہاد کی وضاحت حدیث میں اس طرح بیان ہوتی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ :

جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صلَّی اللّٰہ علیه وسلم فَقَالَ : الرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِیُرٰی مَکَانُهٗ فَمَنْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ)) (۱۲)

---

(۱۲) صحیح البخاری' کتاب الجهاد' باب من قاتل لتکون کلمة اللّٰه هی العلیا' ح۲۶۵۵۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب من قاتل لتکون کلمة اللّٰه هی العلیا ح ۱۹۰۴ و کتب السنن۔ دیگر کتب حدیث میں یہ روایت تھوڑے لفظی اختلاف و اضافے کے ساتھ موجود ہے' ملاحظہ ہو' جامع الاصول ۵۸۱/۲ ح ۱۰۶۳

"ایک آدمی نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' اس نے دریافت کیا : ایک آدمی مالِ غنیمت کی نیت سے جنگ میں شریک ہوتا ہے' دوسرا آدمی اپنا نام پیدا کرنے کے لئے آتا ہے' تیسرا آدمی اپنی بہادری کا مظاہرہ کرنے کے لئے پہنچتا ہے' ان میں سے کون اللہ کی راہ میں شمار ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا : "جو آدمی اس لئے لڑے کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو جائے بس وہی اللہ کے راستے میں شمار ہوگا۔"

<u>پانچواں مغالطہ</u> : ایک زمانے تک تو مرنے مارنے اور قتل کی ضرورت تھی' فی زمانہ اس کی ضرورت نہیں' بس دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تزکیہ ہی کافی ہے۔ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ایسی باتیں بعض نادان علماء سے منسوب ہو کر پہنچ رہی ہیں۔

<u>وضاحت</u> : یہ مغالطہ کس قدر بے بنیاد ہے' اس کا اندازہ مندرجہ ذیل حدیث سے ہو جاتا ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا :

((ثَلاَثَةٌ مِنْ اَصْلِ الايْمَانِ : اَلْكَفُّ عَمَّنْ قَالَ : لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَلاَ نُكَفِّرُهُ بِذَنْبٍ وَلاَ نُخْرِجُهُ مِنَ الْاِسْلاَمِ بِعَمَلٍ' وَالْجِهَادُ مَاضٍ مُنْذُ بَعَثَنِيَ اللّٰهُ اِلٰى اَنْ يُّقَاتِلَ آخِرُ هٰذِهِ الامَّةِ الدَّجَّالَ' لاَ يُبْطِلُهُ جَوْرُ جائِرٍ وَلاَ عَدْلُ عَادِلٍ' وَالايْمَانُ بِالْاَقْدَارِ))(۱۳)

"تین چیزیں ایمان کی جڑ اور بنیاد ہیں :(۱) جو کوئی لا الٰہ الا اللہ کہتا ہو اس سے (زبان اور ہاتھ کو) روک لینا' کسی گناہ کی وجہ سے ہم اس کو کافر نہیں کہیں گے' اور نہ ہی کسی کام کی وجہ سے اسے اسلام سے خارج کریں گے۔(۲) جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی بنا کر مبعوث کیا ہے جہاد اس وقت سے جاری ہے اور اس

---

(۱۳) سنن ابی داؤد' کتاب الجهاد' باب فی الغزو مع ائمة الجور ح ۲۵۳۲ والسنن الکبریٰ للبیهقی ۱۵۶/۹' کتاب السیر' باب الغزو مع ائمة الجور۔ اس روایت میں یزید بن ابی نشبہ راوی غیر معروف ہے لہٰذا علماء نے حدیث کو ضعیف کہا ہے' ملاحظہ ہو' جامع الاصول ۲۴۲/۱ ح ۳۲۔

وقت تک (جاری رہے گا) جب اس امت کا آخری فرد دجال سے جنگ کرلے' نہ کسی ظالم کا ظلم اس کو ختم کرسکتا ہے اور نہ ہی کسی عادل کا عدل (۳) اور ہر قسم کی تقدیر پر ایمان لانا"۔

جہاد کا مفہوم اور اس کے مراحل

جہاد کا لغوی معنی :

لفظ "جہاد" جُہد سے نکلا ہے اور "ج ہ د" کے معنی ہوتے ہیں کوشش کرنا' محنت کرنا' تھکنا ـــــ اور جب یہ لفظ "جُہد" بابِ مفاعلہ میں چلا جاتا ہے تو معنی ہوتے ہیں مقابلے میں سخت کوشش کرنا۔ بابِ مفاعلہ کا مصدر فِعال اور مُفاعَلہ دونوں اوزان پر آتا ہے' مثلاً:

قَتَلَ سے مصدرِ مفاعلہ = قِتَال اور مُقَاتَلَة

نَفَقَ سے مصدرِ مفاعلہ = نِفَاق اور مُنَافَقَة

اسی طرح جهد سے مصدر مفاعلہ = جِهَاد اور مُجَاهدة

بابِ مفاعلہ کی دو خوبیاں یا خواص معروف ہیں : مبالغہ (شدت و کثرت) اور مقابلہ (فریق ثانی سے ٹکراؤ)۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ "جُہد" آپ کی یک طرفہ کوشش ہے لیکن جب آپ کی کوشش کے مقابلے میں دوسروں کی کوشش آڑے آگئی تو دونوں طرف سے کوششوں کا ٹکراؤ ہوگا اور ٹکراؤ کی صورت میں ہر فریق بازی لے جانے کے لئے اپنا پورا زور صرف کردے گا۔ اب یہ جہاد اور مجاہدہ بن جائے گا۔ گویا مقابلے میں آپ نے پوری کوشش صرف کردی۔

انگریزی زبان میں جُہد کے معنی ہیں :

To exert oneself one's utmost for something

جبکہ جہاد کا ترجمہ ہو گا :

To struggle for some cause against something or to struggle against heavy odds.

ان الفاظ سے انگریزی زبان میں لفظ "جہد" اور "جہاد" کا فرق واضح ہو گا۔

مراحل جہاد

جہاد کے تین جلی اور نمایاں مراحل ہیں اور ہر مرحلے کے اندر پھر کچھ خفی اور پوشیدہ مراحل بھی ہیں۔

جلی مراحل :

(۱) اپنے نفس کے خلاف جہاد کرنا۔
(۲) معاشرے کے خلاف جہاد کرنا۔
(۳) حکومت اور نظام کے خلاف جہاد کرنا۔

۱) نفس کے خلاف جہاد : ہمارا دل ہمارے جسم کے اندر ہے اور اس جسم کے کچھ حیوانی تقاضے (Animal Instincts) ہیں۔ نفس امارہ بھی ہمارے ساتھ لگا ہوا ہے۔ خواہشات بھی ہیں' شہوات بھی ہیں۔ اب جونہی ایمان دل میں داخل ہوا تو کشاکش شروع ہو گئی۔ ایمان کا تقاضا اور مطالبہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی بات مانو۔ دوسری طرف نفس کہہ رہا ہے کہ نہیں بلکہ میری مانو' میری خواہشات و شہوات پوری کرو۔ چنانچہ اب یہ کشاکش اور رسہ کشی شروع ہو گئی ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے' کلیسا مرے آگے!

یہی سب سے اہم' مرکزی اور بنیادی جہاد ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ اندر ایمان تو داخل ہو لیکن اس طرح کی جنگ اور کشاکش شروع نہ ہو۔ یا پھر وہ ایمان' حقیقی ایمان نہیں بلکہ مجرد دعوائے ایمان ہے' بالفاظِ دیگر ایمان کا خلا ہے۔ کیونکہ جونہی دل میں حقیقی ایمان آئے گا نفس امارہ' خواہشات اور شہوات کے خلاف جنگ شروع ہو جائے گی' ان کے ساتھ تصادم ہو گا۔ نتیجتاً یا ایمان کامیاب ہو گا یا پھر حیوانی داعیات (Animal Instincts) کامیاب ہوں گے۔ یہ جہاد کی اولین منزل

ہے۔ اسی لئے اس کو اصل جہاد کہا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللّٰهِ)) (۱۴)

"اور سچا مجاہد وہ ہے جس نے اللہ کی رضا کی خاطر اپنے نفس کے خلاف جہاد کیا"

۲) معاشرے کے خلاف جہاد : اگر آپ نے اپنے دل پر کنٹرول حاصل کر لیا' اپنے نفس کو زیر کر لیا اور یہ بازی جیت گئے تو اب جہاد آپ کے وجود سے باہر آئے گا۔ باہر ایک ماحول بنا ہوا ہے۔ ایک معاشرہ اپنی اقدار و روایات کے ساتھ قائم ہے' جس میں غلط نظریات موجود ہیں' شرک' الحاد' مادہ پرستی' مفاد پرستی' شیطان کی دعوت وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ اگر فی الواقع دل میں ایمان جم چکا ہے تو لازماً کشاکش اور نظریاتی جنگ شروع ہو گی۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اندر ایمان ہو اور انسان ابطالِ باطل اور احقاقِ حق سے غافل ہو جائے۔ یہی نظریاتی جہاد ہے جس میں دعوت و تبلیغ کی خاطر جان و مال کو کھپانا شامل ہے۔

۳) نظام اور حکومت کے خلاف جہاد : معاشرہ چاہے سرمایہ دارانہ ہو یا جاگیردارانہ' کمیونزم کو مانتا ہو یا سوشلزم کو' ظالمانہ ہو یا آمرانہ' یعنی اللہ کے سوا کسی اور کا قانون چل رہا ہو' تو اگر ایمان موجود ہے تو اس کا لازمی تقاضا ہو گا کہ ایسے فاسد نظام سے ٹکرا جاؤ۔ اب بات نظریاتی نہیں رہے گی' کیونکہ اس نظام کے ساتھ مراعات یافتہ طبقات کے مفادات اور vested interests وابستہ ہیں۔ وہ ٹھنڈے پیٹوں آپ کی بات نہیں چلنے دیں گے' بلکہ وہ اس نظام کا ہر قیمت پر تحفظ و دفاع کریں گے' اور آپ کو ان سے ٹکرانا ہو گا۔ یہ طاقت کا طاقت سے بالفعل ٹکراؤ ہو گا۔ یہی جہاد کی تیسری اور بلند ترین منزل ہے' جہاں پہنچ کر جہاد قتال کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

---

(۱۴) مسند احمد ۲۱/۶ و المستدرك للحاکم ۱۱/۱ و المعجم الکبیر للطبرانی ۷۹۶/۱۸ و کشف الاستار ح ۱۱۴۳۔ علامہ شعیب الارناؤوط نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح ابن حبان ۲۰۳/۱۱ ح ۴۸۶۲ طبع الرسالۃ۔

جہاد کے تفصیلی مراحل :

اوپر ہم نے جہاد کی تین منزلیں بیان کی ہیں۔ ان کو تین سے ضرب دیں گے تو یہ نو بن جائیں گی، جن کی تفصیل کچھ یوں ہے :

(۱) نفس امارہ کے خلاف جہاد، کیونکہ نفس امارہ ہمیشہ بدی پر اکساتا ہے، لہٰذا یہاں سے ہی جہاد کی ابتداء ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِىۡ‌ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَةٌ ۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىۡ‌ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ‏ ۝﴾ (یوسف : ۵۳)

"میں اپنے نفس کی پاکیزگی بیان نہیں کرتا، بے شک نفس تو برائی پر ابھارنے والا ہی ہے، مگر یہ کہ میرا پروردگار ہی رحم کردے، یقیناً میرا پالنے والا بڑی بخشش کرنے والا اور بہت مہربانی فرمانے والا ہے"۔

(۲) شیطان کے خلاف جہاد، جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ "یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ" وہ لوگوں کے دلوں میں پھونکیں مارتا ہے، وسوسہ ڈالتا ہے، مختلف حربوں سے مغالطہ انگیزی کرتا ہے، حیلہ سازی و بہانہ سازی سکھاتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے خبردار کرتے ہوئے فرمایا :

﴿ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَـكُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡهُ عَدُوًّا‌ ؕ ﴾ (فاطر : ۶)

"شیطان یقیناً تمہارا دشمن ہے اور تم بھی اس کو دشمن بنا کر رکھو۔"

(۳) بگڑے ہوئے اور کافر و ملحد معاشرے کے خلاف جہاد۔ یہ معاشرہ تم کو اپنی اقدار و روایات کے مطابق چلانا چاہتا ہے۔ دوسری طرف تم کو ایمان کے تقاضے کے مطابق اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرنی ہے۔ چنانچہ یا تو تم معاشرے کو بدل دو ورنہ وہ تم کو بدل دے گا۔ ظاہر بات ہے معاشرے کو بدلنے کے لئے تمہیں معاشرے کے تینوں طبقات کے خلاف جہاد کرنا ہو گا۔ اور ابتدائی مرحلے میں جہاد باللسان سے آغاز کرنا ہو گا۔

(۴) معاشرے پر اتمامِ حجت کے لئے تعلیم یافتہ طبقے (intellectuals) کو دعوت

دی جائے گی "بِالحکمۃِ" کہ بات ان کے دل کو لگے اور سمجھ آجائے۔

(۵) عوام کو دعوتِ ایمان و اصلاح دی جائے گی "بِالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ" کیونکہ ان کی سمجھ بوجھ کا معیار اسی سطح پر بات سمجھ سکتا ہے۔

(۶) بگڑے ہوئے لوگوں کو، جن کی سلیم الفطرت روحیں مسخ ہو چکی ہوں، دعوت دی جائے گی مجادلے اور مناظرے کے ذریعے۔

ان تینوں سطحوں پر دعوت کے لئے مختلف صلاحیتوں کے افراد درکار ہوں گے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا :

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ﴾ (النحل : ۱۲۵)

"اے نبی! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔"

اور یہیں سے یہ اصول اخذ کیا گیا ہے : "كَلِّمِ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ" یعنی لوگوں کی عقل کے مطابق ان سے گفتگو کی جائے۔ اور ہر طبقے کے افراد پر اتمامِ حجت بھی اسی طرح ہو سکتی ہے، جس کی خاطر انبیاء و رسل علیہم السلام کو مبعوث فرمایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزاً حَكِيْمًا ﴾ (النساء : ۱۶۵)

"یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور متنبہ کرنے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے، اور اللہ بہرحال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔"

(۷) اتمامِ حجت کے بعد لازماً اظہارِ دین یا غلبۂ دین کا مرحلہ درپیش ہو گا۔ اس میں سب سے پہلے یک طرفہ تصادم ہو گا، لوگ ماریں گے، پیٹیں گے، قتل کریں گے، لیکن تم کو صرف صبر کرنا ہے۔ مکہ مکرمہ میں کم سے کم آٹھ سال تک رسول اللہ ﷺ

اور آپؐ کے ساتھیوں کا طرزِ عمل یہی رہا کہ جبر و تشدد برداشت کرنا ہے' سزا جھیلنا ہے' مگر جوابی کارروائی نہیں کرنی' اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھانا۔

(۸) مصائب جھیلنے کے ساتھ ساتھ اپنی قوت مجتمع کرتے رہو اور جب مناسب قوت حاصل ہو جائے تو صبر محض والا جہاد اقدام اور چیلنج کی شکل اختیار کر جائے گا۔ پھر ایک ایک برائی کو چیلنج کرتے ہوئے اس کا گھیرا تنگ کر دیا جائے گا۔ گھیراؤ اور پکٹنگ کی اصطلاحات اسی ضمن میں استعمال ہوتی ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے جب منکر کو ہاتھ کی طاقت سے روکا جائے گا' جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ . . . الحدیث)) (۱۵)

"تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ کی طاقت سے بدل دے' اگر یہ نہ کر سکتا ہو تو زبان سے روکے.....الخ"

(۹) جب نظامِ باطل کو ہاتھ کی طاقت سے روکا جائے گا تو ظاہر ہے کہ وہ پلیٹ میں رکھ کر اختیارات آپ کے حوالے تو نہیں کر دے گا' بلکہ بھرپور مقابلہ کرے گا اور اپنے وجود کی بقا کے لئے سارے جتن کر ڈالے گا اور یہیں سے مسلح ٹکراؤ شروع ہو گا۔ یہ جہاد کی آخری اور نویں منزل ہے' جہاں جہاد قتال کی شکل اختیار کر چکا ہو گا۔ اس کے بعد یا باطل نظام ختم ہو جائے یا جہاد کرنے والے شہید ہو کر اللہ کے حضور سرخ رُو ہو جائیں گے۔

جہاد کی مختلف صورتیں :

جہادِ زندگانی : انسان کو اپنی بقا کے لئے بھی ایک قسم کا جہاد کرنا پڑتا ہے۔ یعنی بقائے ذات (Preservation of the self) کی خاطر جہاد۔ بقائے ذات کی

(۱۵) صحیح مسلم' کتاب الایمان' ح ۴۹۔ و سنن الترمذی' کتاب الفتن' ح ۲۱۷۳ و سنن ابی داؤد' کتاب العیدین ح ۱۱۴۰۔ و دیگر کتب حدیث۔

خاطر انسان کو رزق' سر چھپانے کو جگہ اور لباس چاہئے' نیز دیگر لوازمات درکار ہوں گے۔ ان کے حصول میں مقابلہ بازی (Competition) ہو گی جسے Struggle for existence کہا گیا ہے۔ اسی طریقے سے بقاء نوع (Preservation of the species) کی خاطر جہاد ہے۔ اس کے لئے شادی کی ذمہ داریاں اٹھانی ہوں گی اور یہ وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان اور مؤمن کر رہا ہے۔ چونکہ وہ اس میں ناجائز ذرائع استعمال نہیں کرتا بلکہ رزق حلال کماتا ہے' شرعی اصولوں کے مطابق نکاح کرتا ہے' جائز تعلق زن و شو قائم کرتا ہے لہٰذا یہ بھی جہاد میں شمار ہو گا۔

حقوق کی خاطر جہاد : اگر کسی خاص طبقے پر ظلم ہو رہا ہو یا عمومی سطح پر ظلم ہو رہا ہو تو اس ظلم سے نجات پانے کی خاطر جنگ کرنا یا جدوجہد کرنا بھی جہاد کا حصہ ہے۔ اسی طرح اپنے معاشی یا سیاسی حقوق حاصل کرنے کی خاطر محنت و جدوجہد کرنا' بالخصوص اگر سیاسی حقوق غصب کر لئے گئے ہوں تو ان کو حاصل کرنا شیر کے منہ سے نوالہ نکالنے والی بات ہوتی ہے۔ اگر معاشی استحصال (Exploitation) ہو تو ایسے ظالموں کا ہاتھ روکنا' یہ سب جہادِ زندگانی کے حصے اور اجزاء ہیں۔ اسی طرح اگر کسی فرد نے فرد کو یا قوم نے قوم کو محکوم بنا رکھا ہو' ان کی آزادی سلب کر لی ہو تو آزادی حاصل کرنے کی خاطر محنت و جدوجہد کرنا بھی فی الواقع جہاد ہے اور یقیناً اگر کسی فرد یا قوم کے اندر حمیت نام کی کوئی چیز زندہ ہو گی تو وہ مرجانا گوارا کر لیں گے غلامی قبول نہیں کریں گے۔ چونکہ ایک مسلمان حصول مقاصد کے لئے جائز ذرائع استعمال کرتا ہے اس لئے اس کی ساری کوشش و محنت جہاد کے زمرے میں آتی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے تحفظ دین' تحفظ مال' تحفظ جان اور تحفظ عزت کی خاطر جان قربان کر دینے والوں کو شہید کا درجہ دیا ہے' فرمایا :

((مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دَمِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ دِيْنِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ وَمَنْ قُتِلَ دُوْنَ اَهْلِهٖ فَهُوَ

شَہِیْدٌ)) (۱۶)

"جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے اور جو شخص اپنی ذات کی حفاظت میں مارا گیا وہ بھی شہید ہے اور جو شخص دین کی حفاظت میں مارا گیا وہ بھی شہید ہے اور جو شخص اپنے اہل خانہ کی حفاظت (جان و عزت) میں مارا گیا وہ بھی شہید ہے۔"

البتہ مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ناجائز ذرائع اور ہتھکنڈے استعمال کرے۔ مسلمان کو تو یہاں تک حکم ہے کہ دوران جہاد و قتال غیر ضروری نقصان نہ کرے' مثلاً دشمن کے علاقے سے درخت بھی نہ کاٹے۔ البتہ ایک خاص موقع پر حکم قرآنی کے بعد درخت کاٹے گئے اور گھر برباد کئے گئے۔ ورنہ عموماً حکم یہی ہے کہ نہ تو دشمن کے گھر برباد کئے جائیں یعنی سول آبادی کو نقصان نہ پہنچایا جائے اور نہ بچوں' بوڑھوں' عورتوں' عبادت گاہوں میں موجود بے ضرر افراد کو نقصان پہنچایا جائے' نہ فصلوں کو برباد کیا جائے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کا جہادِ حریت شرعی جہاد ہے بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط کی پابندی کی جائے۔

جہاد برائے تلاش حقیقت : تاریخ دعوت و عزیمت پر نظر ڈالیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی جہاد برائے تلاش حقیقت سے بھرپور نظر آتی ہے۔ یقیناً اور لوگ بھی اسی راہ کے مسافر رہ چکے ہیں لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعات مصدقہ ذرائع سے ہمارے پاس پہنچے ہیں اور تا اَبد محفوظ ہیں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد حضرت سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ کی زندگی جہاد برائے تلاش حقیقت سے عبارت ہے۔

---

(۱۶) سنن الترمذی' کتاب الدیات' باب ماجاء فیمن قتل دون مالہ فھو شھید' ح ۱۴۱۸ و ۱۴۲۱۔ وسنن ابی داؤد' کتاب السنۃ' باب فی قتال اللصوص' ح ۴۷۷۲۔ و سنن النسائی' کتاب تحریم الدم' باب من قاتل دون مالہ۔ ومسند احمد ۱/۱۹۰۔ محدثین نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔

آپ ایران سے شام اور شام سے یثرب (مدینہ منورہ) پہنچے اور مقصود صرف حقیقت کی تلاش تھا۔ یہ بھی بہت بڑا جہاد ہے۔

جہاد برائے ترقی ایمان : ایمان کو پانے اور حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا یقیناً بہت بڑا جہاد ہے۔ اگلے مرحلے میں ایمان پر قائم رہنے اور اس کو ترقی دینے کے لئے محنت کرنا بھی ایک جہاد ہے۔ ہم سب عالم اسباب میں رہتے ہیں اور یہ اسباب ہم پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ جذبہ ایمان پر بشری تقاضوں کی اوس پڑتی رہتی ہے۔ مسکن ایمان یعنی دل پر گناہوں اور لغزشوں کی گرد آتی رہتی ہے۔ اس لئے مسلسل ذکر اور استحضار اللہ فی القلب کا حکم ایمان کو صاف اور صیقل کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ ایمان کو محض قائم رکھنا اور برقرار رکھنا ہی مطلوب نہیں بلکہ آگے بڑھ کر اس کی گہرائی اور گیرائی میں اضافہ بھی مقصود ہے۔ اگر ترقی کرنے کی بجائے ایک جگہ ہی پڑاؤ کر لیا گیا تو عین ممکن ہے کہ کسی دن پستی کی طرف سفر شروع ہو جائے جو بہت بڑا خسارہ ہے۔

ایمان اور اسلام کا معاملہ ایک درخت کی مانند ہے۔ جوں جوں درخت کی شاخیں اور ٹہنیاں بڑھتی چلی جائیں گی اسی اعتبار سے اس کی جڑیں زمین میں گہری ہوتی چلی جائیں گی، یعنی جس نسبت سے اسلام کے ظاہری احکام پر عمل ہوگا اسی تناسب سے ایمان کی جڑیں دل میں مضبوط ہوتی چلی جائیں گی اور وہ دل میں گہری ہوتی چلی جائیں گی۔ چنانچہ ایمان کو قائم اور زندہ رکھنے بلکہ پروان چڑھانے کے لئے بھی ایک مسلسل کوشش و محنت کرنا پڑتی ہے، جسے جہاد برائے ترقی ایمان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ مؤمن کا ہر لمحہ جہاد سے عبارت ہے اور وہ ہر وقت حالت جہاد میں ہے۔

جہاد فی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کا فرق :

مکی سورتوں میں "جہاد فی اللہ" کی اصطلاح وارد ہوئی ہے۔ فرمایا :

﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ (الحج : ۷۸)

"اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔"

نیز فرمایا :

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ (العنکبوت : ۶۹)

"جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے۔"

دوسری طرف مدنی سورتوں میں "جہاد فی سبیل اللہ" اور "قتال فی سبیل اللہ" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حصول ایمان کی کوشش اور ایمان کی گیرائی اور گہرائی میں محنت کو جہاد فی اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور دعوت و تبلیغ اور اقامت دین کی محنت کو "جهاد فی سبیل اللّٰه" کہا جائے گا.... واللہ اعلم بالصواب۔

وسائل جہاد :

وقت اور ضرورت کی مناسبت سے جہاد کا انداز اور اسلوب مختلف ہو گا۔ اس لئے کبھی ہاتھ سے جہاد ہو گا، کبھی زبان سے اور کبھی دل سے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) (۱۷)

"جو ان کے خلاف ہاتھ سے جہاد کرے وہ مؤمن ہے اور جو زبان سے جہاد کرے وہ بھی مؤمن ہے اور جو دل سے ان کے خلاف جہاد کرے وہ بھی مؤمن ہے۔ اس کے بعد رائی کے دانے جتنا بھی ایمان نہیں ہے۔"

اور اس جہاد کے لئے جو ہتھیار استعمال ہو گا وہ قرآن کا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا :

---

(۱۷) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب کون النهی عن المنكر من الایمان، ح ۵۰۔

﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾ (الفرقان : ۵۲)

"پس (اے نبی!) کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو"۔

خارج میں جہاد سے پہلے داخل میں جو نفس سے جہاد ہو گا اس کا ہتھیار بھی قرآن حکیم ہی ہے۔ فرمایا :

﴿ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴾ (المزمل : ۴)

"اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو"۔

کیونکہ اندر کو شیطانی وسوسوں سے پاک صاف کرنے والی شے قرآن حکیم ہی ہے۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کی عکاسی اپنے اشعار میں اس طرح کی ہے۔

کشتن ابلیس کارے مشکل است
زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوش تر آں باشد مسلمانش کنی
کشتۂ شمشیر قرآنش کنی!

"ابلیس کو مارنا ایک مشکل کام ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں میں جا کر ڈیرا لگا لیتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے مسلمان بنا دو اور قرآن کی تلوار سے اس کا قلع قمع کر دو"۔

حقیقت میں علامہ اقبال نے ان دو شعروں میں دو حدیثوں کے مدعا کو جمع کر دیا ہے۔

پہلی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے :

((اِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِىْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ)) (۱۸)

---

(۱۸) مسند احمد ج ۳، ص ۱۵۶ و ۲۸۵ و ۳۰۹، ج ۶، ص ۳۳۷۔ و صحیح البخاری، کتاب الاعتکاف، باب هل یخرج المعتکف لحوائجه الی باب المسجد، ح ۱۹۳۰ و صحیح مسلم، کتاب السلام، باب ۹ ح ۲۱۷۵ و سنن ابی داوٗد، کتاب السنة، باب فی ذراری المشرکین، ح ۴۷۱۹

"یقیناً شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑتا ہے۔"

صحیح بخاری میں یہ حدیث سات جگہ بیان ہوئی ہے' ایک جگہ الفاظ کچھ یوں ہیں :

((اِنَّ الشَّیْطَانَ یَبْلُغُ مِنَ الْاِنْسَانِ مَبْلَغَ الدَّمِ))

"شیطان انسان کے ہر اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں جہاں تک خون پہنچتا ہے۔"

ظاہر بات ہے ایسے [illegible] زہر کا تریاق بھی کوئی ایسا ہی عدیم النظیر ہونا چاہئے جو جسم انسانی کے رگ و ریشے تک پہنچے اور زہر کا مداوا کرے۔ اور یہ صرف قرآن حکیم ہی ہو سکتا ہے۔

[illegible] ث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((مَا مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلاَّ وَقَدْ وُکِّلَ بِهٖ قَرِیْنُهٗ مِنَ الشَّیَاطِیْنِ))

قَالُوْا: وَا[illegible] ت یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ :((نَعَمْ وَلٰکِنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِی عَلَیْهِ فَاَسْلَمَ)) (19)

"تم میں سے ہر [illegible] ایک کے ساتھ شیاطین میں سے ایک ساتھی ہے"۔ صحابہ کرام [illegible] ن کیا : یارسول اللہ! کیا آپ کے ساتھ بھی؟ فرمایا "ہاں' البتہ اللہ تعالیٰ نے میری [illegible] مدد فرمائی ہے اور وہ تابع فرمان ہو گیا ہے۔"

(ایک روایت [illegible] کے الفاظ ہیں کہ : وہ مجھے صرف بھلائی کی بات کہتا ہے)

اور قرآن [illegible] یم [illegible] ہی دعوت و تبلیغ اور انذار و تبشیر کا ذریعہ اور مرکز ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مندرجہ فرمودہ [illegible] ات پر ذرا غور کریں گے تو بات واضح ہو جائے گی۔ فرمایا :

﴿فَذَکِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ﴾ (ق : ۴۵)

(19) مسند احمد ۲۵۷/۱ شرح احمد شاکر ح ۲۳۲۳۔ والمعجم الکبیر للطبرانی ۸۶/۱۲ ح ۱۲۶۳۰ (بروایۃ عبداللہ بن عباس ؓ) معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ صحیح مسلم' کتاب المنافقین' باب تحریش الشیطان ح ۲۸۱۴ (بروایۃ عبداللہ بن مسعود ؓ) و مسند احمد ۳۸۵/۱۔ شرح احمد شاکر ۳۶۴۸ ۔ نیز متعدد صحابہ کرام ؓ سے یہ حدیث مروی ہے' ملاحظہ ہو مجمع الزوائد للہیثمی ۲۲۵/۸ ح ۱۳۸۵۶ و مابعد

"پس تم اس قرآن کے ذریعے اسے یاددہانی کراؤ جو میری تنبیہ سے ڈرے"۔

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بڑے زور دار الفاظ میں تبلیغ قرآن کا حکم دیا ہے، فرمایا :

﴿ یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ﴾ (المائدۃ : ٦٧)

"اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچادو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا"۔

اور رسول اکرم ﷺ نے یہی حکم اپنی امت کو دیا۔ فرمایا :

((بَلِّغُوا عَنِّی وَلَوْ آیَةً))[۲۰]

"میری طرف سے دوسروں کو پہنچادو، خواہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو"۔

کیونکہ یہ قرآن ہی تبشیر و انذار کا صحیح ذریعہ ہے۔ متعدد آیاتِ قرآنیہ اس مضمون کو بیان کر رہی ہیں۔ بس ذرا توجہ سے قرآن حکیم کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔

البتہ جب مرحلۂ دعوت و تبلیغ اور انذار و تبشیر سے آگے قدم بڑھا کر میدانِ کارزار میں اتریں گے تو طاقت کا طاقت سے ٹکراؤ ہو گا۔ اس موقع پر جسمانی طاقت اور اسلحہ کی طاقت آپس میں ٹکرائے گی۔ ایسے ہی موقع کی مناسبت سے آپ ﷺ نے طاقتور مؤمن کو دوسرے کے مقابلے میں "خیر" قرار دیا ہے۔ فرمایا :

((المُؤْمِنُ القوِیُّ خیرٌ واَحبُّ اِلی اللّٰہ من المُومن الضَّعیف))[۲۱]

"طاقتور مؤمن کمزور مؤمن کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہے اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے"۔

---

(۲۰) صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل ح ۳۴۷۴۔ و سنن الترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی الحدیث عن بنی اسرائیل ح ۲۶۷۱۔

(۲۱) صحیح مسلم، کتاب القدر، باب فی الامر بالقوۃ ... الخ ح ۲۶۶۴۔ و سنن ابن ماجہ، المقدمہ، باب فی القدر ح ۷۹۔ و مسند احمد ۲/۳۷۰۔ استاذ احمد شاکر نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، شرح احمد شاکر ح ۸۸۱۵۔

علامہ اقبال نے جہاد کے لئے جینے اور اس راہ میں مرنے کے لئے مضبوط جسم و جان کی اہمیت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے!

ہماری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان حقیقی کا لازمی نتیجہ (Inevitable Result) جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اگر دعوائے ایمان کے ساتھ جہاد شامل ہے تو ایمان حقیقی موجود ہے ورنہ بس قانونی اسلام ہے' کیونکہ جہاد ارکانِ اسلام میں تو شامل نہیں' البتہ حقیقی ایمان کا رکن رکین ہے۔ سورت الحجرات آیت ۱۵ میں ایمانِ حقیقی کے دو رُکن بیان ہوئے ہیں :

(۱) دل میں غیر متزلزل ایمان جس میں شک کا شائبہ تک نہ ہو۔
(۲) عمل میں جہاد جو اصلاحِ نفس سے شروع ہو کر قتال تک جاتا ہو۔

بابِ ششم

ایمان اور نفاق

نفاق کا لغوی معنی :

نفاق کا مادہ "ن ف ق" ہے۔ نفق عربی زبان میں سرنگ کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ سورۃ الانعام میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فرمایا :

﴿ وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ﴾ (الانعام : ۳۵)

"تاہم ان لوگوں کی بے رخی اگر تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ دیا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔"

نفق (سرنگ) ایسے زیر زمین راستے کو کہتے ہیں جس کے دو مُنہ ہوں' جو کہ جان بچانے کے لئے راہِ فرار کا کام دے۔ اگر ایک طرف سے دشمن کا خطرہ ہو تو دوسری طرف نکلا جاسکے۔ اسی طرح گوہ کے بل کو بھی "نافقاء" کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے بھی دو طرف مُنہ ہوتے ہیں۔

"نَفَقَ" سے ایک فعل اَنْفَقَ يُنْفِقُ اِنْفَاق آتا ہے جس کے معنی ہیں خرچ کرنا ـــــ دوسرا فعل نَافَقَ' يُنَافِقُ آتا ہے جس کا مصدر ہے مُنَافَقَةٌ (جسے ہم اردو زبان میں منافقت لکھتے ہیں) یا نِفَاقٌ۔ جیسے جھد سے مُجَاهَدَةٌ اور جہاد ہے' جس کی تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ جس بل کے دو مُنہ ہوں اسے "نافقاء" کہا جاتا ہے' جس راستے کے دو مُنہ ہوں وہ "نفق" کہلاتا ہے اور جس انسان کے دو مُنہ ہوں وہ "منافق" کہلاتا ہے۔ یعنی جس کا ایک چہرہ (Face) ادھر ہوتا ہے تو دُوسرا ادھر۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے کردار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :

﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ○ ﴾ (البقرة : ۱۴)

"اور جب یہ (منافق) اہل ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں اور جب علیحدگی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں اصل میں تو ہم تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں (اہل ایمان) سے تو مذاق کر رہے ہیں۔"

حقیقت نفاق :

نفاق بھی اصلاً کفر کی شکل ہے' لیکن یہ کفر ظاہری اور قانونی نہیں بلکہ کفر باطنی ہے' کیونکہ منافق دل سے تو کافر ہی ہوتا ہے۔ قانونی ایمان کی ضد کفر ہے اور حقیقی ایمان کی ضد نفاق ہے۔ اور نفاق اللہ تعالیٰ کے ہاں کفر سے بھی زیادہ مغضوب و مبغوض اور ناپسندیدہ ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا غضب جس قدر منافقوں پر بھڑکا ہے اتنا کافروں پر بھی نہیں بھڑکا۔ فرمانِ ربّانی ہے :

﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ ﴾ (النساء : ۱۴۵)

"بلاشبہ منافقین تو آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے"۔

نفاق کی اصل بنیاد :

گوہ دو منہ والا بل اس لئے بناتی ہے کہ خطرے کے وقت جان کی حفاظت ہو سکے۔ اسی طرح منافق بھی کفر اور اسلام دونوں کے ساتھ رشتہ استوار رکھتا ہے کہ خطرے کے وقت جان و مال کی حفاظت ہو سکے۔ اور چونکہ جہاد کے موقع پر جان و مال ہی خرچ کرنے کی نوبت آتی ہے اس لئے منافق سب سے زیادہ جہاد سے خائف ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جہاد میں جان و مال سے شریک ہونا تو منافق کی نگاہ میں خسارہ ہی خسارہ ہے اور اگر شریک نہیں ہوتے تو معاشرے میں نکوا اور نکمے بن کر رہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ لہٰذا جان و مال بچانے کے لئے وہ نفاق کی راہ اپناتا ہے اور عمل میں جہادی سرگرمیوں سے ہمیشہ گریزاں رہتا ہے کہ کہیں اس کا نفاق آشکارا نہ ہو جائے۔

نفاق کے مراحل

نفاق کے مراحل سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ جو شخص اقامت دین کی انقلابی دعوت کو قبول کرتا ہے' حق کی صدا پر لبیک کہتا ہے' دل کی گہرائی سے اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہے' وہ قوی الارادہ اور قوی الایمان ہوتا ہے' لہٰذا جونہی کوئی دینی تقاضا اس کے سامنے آئے گا وہ فوراً حاضر ہو گا اور اس کا کردار گواہی دے رہا ہو گا کہ ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریت جاں' راحت تن' صحت داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی

یہ ایک رویہ ہے جو خلوص و اخلاص اور صدق ایمان کی عملی گواہی ہے' لہٰذا اس کا ترقی کی طرف سفر شروع ہو گا' جو بے انتہا ترقی کی طرف بڑھتا ہی چلا جائے گا۔

ضعف ایمان :

سابقہ رویے کو اگر خلوص و اخلاص اور کمال کا نام دیا جائے تو اس کے بالمقابل "گریز" کا رویہ آتا ہے۔ یہ یقیناً نفاق یا منافقت نہیں ہے' لیکن کمال ایمان بھی نہیں ہے' بلکہ یہ ضعف ایمان کی شکل ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی سے کسی وجہ سے انقلابی جماعتی معاملے میں کمزوری یا کوتاہی سرزد ہو گئی۔ چنانچہ سب سے پہلے اس کا کھلے دل سے اعتراف کرے' اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کرے' اپنی جماعت سے معذرت کرے' قائد سے معافی مانگے اور اہل جماعت سے بھی اپنے لئے استغفار کی درخواست کرے۔

اسے مرض نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ ضعف ایمان شمار ہو گا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح جسمانی ساخت میں طاقتور اور کمزور لوگ پیدا کئے ہیں اسی طرح ایمانی

کیفیت میں بھی طاقتور اور کمزور لوگ ہیں اور رہیں گے۔ سب لوگ برابر نہیں ہو سکتے' حتیٰ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی سب کا ایمان یکساں نہیں تھا۔

مرض کا پہلا درجہ : جھوٹا بہانہ

مشکل یہ ہے کہ انسان کے اندر ایک جھوٹی عزت نفس بھی موجود ہے۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا :

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ ﴾ (البقرۃ : ۲۰۶)

"اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو تکبر اور تعصب اس کو گناہ پر ابھارتا ہے' پس ایسے آدمی کے لئے جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔"

کیونکہ یہ جھوٹی عزت نفس انسان کو گناہ پر آمادہ کرتی ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ آپ نے دس مرتبہ معذرت کی اور وہ مان لی گئی' گیارہویں مرتبہ نفس کہتا ہے کوئی جھوٹا بہانہ بناؤ' روز روز کی معذرت سے عزت نفس مجروح ہو رہی ہے۔ بس جہاں سے جھوٹا بہانہ شروع ہوا بیماری کا بیج پڑ گیا۔ کتاب و سنت کا مطالعہ کر دیکھیں' نفاق اور منافق کے بیان میں "کذب" (جھوٹ) کا تذکرہ کثرت سے ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ : ۱۰)

"اور ان کے لئے دردناک سزا ہے' اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔"

رسول اللہ ﷺ نے منافق کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا :

((وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ)) (بخاری و مسلم)

"اور جب بات کرے جھوٹ بولے"

یہاں احتیاط رہنی چاہئے' اس کیفیت کو ابھی "نفاق" سے تعبیر نہ کیا جائے بلکہ یہ مرض کی پہلی منزل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اسے بیماری اور روگ کے نام سے بیان فرمایا ہے :

﴿ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ﴾ (البقرۃ : ۱۰)

"ان کے دلوں میں روگ ہے' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے روگ کو اور بڑھا دیا ہے"

مرض کا دوسرا درجہ : جھوٹی قسمیں

ظاہر بات ہے کہ جھوٹے بہانے کب تک کام دیں گے' آخر سننے والے بھی سر میں دماغ رکھتے ہیں۔ جونہی بھانڈا پھوٹا' اعتبار اٹھ گیا' تو اب جھوٹی قسموں کا سہارا لیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (المنافقون : ۲)

"انہوں نے اپنی قسموں کو اپنے لئے ڈھال بنا رکھا ہے جس کی آڑ میں وہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہیں' یقیناً بہت برا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔"

کس چیز کے خلاف ڈھال؟ اپنی جان و مال کھپانے کے خلاف ڈھال' کہ کہیں جان و مال کا نقصان نہ ہو جائے۔ کیونکہ منافقین کو یہی دو چیزیں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتی ہیں۔ غزوۂ تبوک کے ضمن میں حضرت کعب بن مالک[1] رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما ہوئے تو ایک ایک کر کے منافق آتے گئے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی صفائی پیش کرتے گئے اور آپ تسلیم کرتے گئے۔ اس طرح ان منافقوں نے اپنی قسموں کو ڈھال اور تحفظ کا سامان بنا لیا۔

مرض کا آخری درجہ : اللہ اور رسولؐ کے ساتھ بغض و عداوت

اس بغض و عداوت کی وجہ ایک نفسیاتی روگ ہے کہ جب بھی کوئی امتحان یا آزمائش کا وقت آتا ہے تو ان کو منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملتی۔ مثلاً ایک معاشرے

---

(۱) جو مخلص صاحب ایمان صحابہ غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ گئے تھے ان کا ایمان افروز واقعہ تفہیم القرآن ۲/۲۴۵ تا ۲۴۹ تفسیر سورۃ التوبہ حاشیہ ۱۱۹ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (مرتب)

میں سو آدمی رہتے ہیں' ان میں سے پچاس صادق الایمان ہیں اور پچاس مریضانہ ذہنیت والے ہیں۔ صادق الایمان حضرات کا کردار یہ سامنے آتا ہے کہ جونہی صدا لگی لبیک کہا اور جس حال [۲] میں بھی تھے حاضر ہو گئے۔ یہ حاضری اور یہ فداکاری ان کے خلوص وایمان کی دلیل بن گئی جبکہ دوسرے پیچھے رہ گئے۔ اب پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں میں مخلصین کے خلاف بغض وعناد پیدا ہونا شروع ہو گیا کہ یہ لوگ پاگل' بے وقوف اور دیوانے (Fanatics) ہیں۔ منافقین' مخلص اہل ایمان کے لئے لفظ "السفھاء" اسی معنی میں استعمال کرتے تھے۔ فرمایا :

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ.... ﴾ (البقرۃ : ۱۳)

"اور جب ان سے کہا گیا کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں تو انہوں نے جواب دیا : کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟"

گویا کہ منافقوں کی نظر میں یا ان کی رائے میں مخلص اور فدائی مسلمان بے وقوف ہیں' انہیں بھلے برے کی تمیز نہیں' موت کا خوف نہیں' مستقبل کی فکر نہیں اور اولاد و گھر بار کا خیال نہیں' بس ہر وقت جان ہتھیلی پر رکھے ہوئے حاضر ہیں۔

---

(۲) غزوۂ احد کے موقع پر جب جہاد کی ندا بلند ہوئی تو حضرت حنظلہ بن ابی عامر رضی اللہ عنہ حالت جنابت میں تھے' انہوں نے اتنا توقف بھی نہیں کیا کہ غسل کر لیں اور حاضر ہو جائیں' بلکہ فوراً لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو گئے اور دورانِ معرکہ شہید ہو گئے۔ عام طور پر شہید کو غسل نہیں دیا جاتا' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اسے فرشتے غسل دے رہے ہیں۔ حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے ان کے اہل خانہ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ حضرت حنظلہ حالت جنابت میں ہی معرکے میں چلے گئے تھے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اسی لئے اسے فرشتوں نے غسل دیا ہے۔ ملاحظہ ہو الاستیعاب' حالات زندگی ۵۶۷ و اسد الغابۃ حالاتِ زندگی ۱۲۸۱ والمستدرک ۲۰۴/۳ والاصابۃ ۱۱۹/۲' اور دیگر حالات صحابہ پر مشتمل کتب تاریخ (اضافہ از مرتب ابوعبدالرحمٰن)

جیسے جیسے یہ تضاد نمایاں ہو رہا ہے اسی نسبت سے ان کا غم و غصہ بھڑک رہا ہے۔ عربی زبان کی مثال ہے "تُعرَفُ الاشیاءُ بِاَضْدا دِھا" یعنی چیزوں کی پہچان برعکس چیزوں سے ہوتی ہے۔ اگر کوئی امتحان و آزمائش کا موقع ہی نہ آتا یا سب کے سب ایک حال پر بیٹھے رہ جاتے تو نہ مخلص و منافق کی پہچان ہوتی اور نہ کسی کا ضعف ایمان ہی ظاہر ہوتا۔ لیکن جب کچھ لوگ انقلابی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور کچھ بیٹھے رہ گئے تو جو اٹھ کھڑے ہوئے ان کے اٹھنے کی وجہ سے بیٹھنے والوں کی کیفیت نمایاں ہو گئی۔ اب انہیں بیٹھے بیٹھے مخلصین پر غصہ آ رہا ہے' ان کے خلاف دل میں ایک الاؤ جل رہا ہے' غیظ و غضب سے لال پیلے ہو رہے ہیں۔ یہ ہے مرض کا تیسرا اور آخری درجہ جو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی دشمنی پر مشتمل ہے کہ انہوں نے ہمیں کس مصیبت میں ڈال رکھا ہے' ہر وقت کوئی نہ کوئی نئی مصیبت کھڑی ہے' نہ کوئی مشورہ سنتے ہیں نہ بات مانتے ہیں' ہر وقت بس ایک ہی دُھن سوار ہے۔ اس کے برعکس صادق الایمان لوگ تو رسول اللہ ﷺ کا احسان مانتے تھے کہ آپؐ کی وجہ سے ہمیں ایمان نصیب ہوا' آپ کی آمد کے بعد اوس وخزرج کا جھگڑا ختم ہوا۔

جب مرض اپنی تیسری منزل کو پہنچ جائے اور دل اللہ اور رسول کی دشمنی سے بھر جائے تو یہ وہ منزل ہے جس کو نفاق کہا جاتا ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی گواہی تاقیامِ قیامت محفوظ کر دی ہے۔ فرمایا :

﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ۝ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۗ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ۝ ﴾ (المنافقون : ۱ تا ۳)

"(اے نبی!) جب تمہارے پاس یہ منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم اس بات

کے گواہ ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ جانتا ہے کہ یقیناً آپ اس کے رسول ہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعاً جھوٹے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے پس اللہ کی راہ سے رک گئے' بے شک بُرا ہے وہ کام جو یہ کر رہے ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ ایمان لا کر پھر کافر ہو گئے' پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی' اب یہ نہیں سمجھتے"۔

مشکلات و مصائب کے وقت مخلصین و منافقین کے احساسات ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں۔

غزوۂ احزاب کا منظر آنکھوں کے سامنے لائیے اور ذرا غور کیجئے کہ ایک چھوٹی سی بستی پر جس کی آبادی چند سو افراد پر مشتمل تھی' پورے عرب کی کافر قوتیں اکٹھے ہو کر چڑھ دوڑیں جس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :

﴿ اِذْ جَآءُ وْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۠ ○ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ○ ﴾

(الاحزاب:۱۰۔۱۱)

"جب کہ دشمن تمہارے اوپر سے اور نیچے سے آ گئے' اور جب کہ آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ تعالیٰ کے بارے میں مختلف گمان کرنے لگے۔ اسی موقع پر مؤمنوں کا امتحان کر لیا گیا اور وہ پوری طرح جھنجھوڑ دیئے گئے"۔

حالات یقیناً ایسے ہی سخت تھے کہ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا کہ کہاں تین ہزار کا لشکر جن کے پاس نہ سواریاں پوری ہیں اور نہ ہتھیار مناسب ہیں' دوسری طرف دس ہزار کا لشکر جرار جس کی پشت پر سارے عرب کی اخلاقی و سیاسی طاقت موجود ہے اور وہ عمدہ ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ ایسے موقع پر منافقوں کا نفاق کھل کر ان کی زبانوں پر آ گیا' کہنے لگے :

﴿ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ○ ﴾ (الاحزاب : ۱۲)

"ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے کئے وہ سب جھوٹے نکلے۔"

کہ ہمیں تو سبز باغ دکھائے گئے تھے کہ قیصرو کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں تلے ہوں گے 'جبکہ حال یہ ہے کہ ہم قضائے حاجت کے لئے بھی باہر نہیں نکل سکتے۔

چونکہ نفاق کی بنیاد جان و مال کا تحفظ ہے اور یہاں دونوں ہی خطرے میں تھے لہٰذا وہ چیخ اٹھے۔ جبکہ دوسری طرف اہل ایمان نے یہی حالات کھلی آنکھوں سے دیکھے تو پکار اٹھے :

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ﴾ (الاحزاب : ۲۲)

"اور جب اہل ایمان نے کافروں کے لشکر کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہی تو ہے جس کا وعدہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے کیا تھا اور بالکل سچ کہا تھا اللہ اور اس کے رسولؐ نے"۔

چونکہ انہیں دُنیوی عارضی مفادات کی بجائے اخروی ابدی بشارتیں مطلوب تھیں جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے اس شرط کے ساتھ کیا تھا کہ تم اس راہ کی تمام مشکلات کا مقابلہ ہمت کے ساتھ کرو گے۔ سورۃ البقرہ کی یہ آیت اس سے قبل نازل ہو چکی تھی کہ :

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ : ۱۵۵)

"اور ہم کسی نہ کسی طرح تمہاری آزمائش ضرور کریں گے دشمن کے ڈر سے' بھوک پیاس سے' مال و جان اور ثمرات کی کمی سے۔ اور (اے نبیؐ!) صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجئے"۔

ایسے موقع پر سچے اہل ایمان کا حالِ دل اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا :

﴿ وَمَازَادَهُمْ اِلَّاۤ اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ۝ ﴾ (الاحزاب : ۲۲)

"تو (لشکرانِ کفار دیکھ کر) ان کے ایمان اور تسلیم و رضا میں مزید اضافہ ہو گیا۔"

ہم یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ ایمانِ حقیقی کی ضد ہے نفاق' جو کہ جہاد فی سبیل اللہ سے گریز کا نتیجہ ہوتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ انسان جہاد سے کیوں بھاگتا ہے؟

ـــ اس لئے کہ غیر اللہ کی محبت' محبت ایمان پر غالب ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کی تصویر اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے :

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ ﴾ (التوبة : ۲۴)

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ' تمہارے بیٹے' تمہارے بھائی' تمہاری بیویاں' تمہارا کنبہ قبیلہ' تمہارے کمائے ہوئے مال اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو اور وہ حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو اگر یہ سب تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو تم اللہ کے حکم (سے عذاب) کے آنے کا انتظار کرو' اللہ تعالیٰ (ایسے) فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

اپنے ایمان کا جائزہ لینے کے لئے یہ آیت عظیم ترین ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان دل میں ایک ترازو نصب کر لے' جس کے ایک پلڑے میں مذکورہ بالا آٹھ محبتوں کو رکھ لے اور دوسرے پلڑے میں "اللہ تعالیٰ کی محبت + اللہ کے رسول کی محبت + جہاد فی سبیل اللہ کی محبت" کو رکھ لے۔ اگر ان تین محبتوں والا پلڑا جھک گیا' تو مبارک ہو' یہی حقیقی ایمان ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہرگز نہیں کہ ان فطری محبتوں سے دست بردار ہو جاؤ یا انہیں تج دو' بلکہ مطالبہ صرف یہ ہے کہ اللہ' رسول اور جہاد کی محبت پر کوئی محبت غالب نہ ہونے پائے' کیونکہ اہل ایمان کا شعار اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ ﴾ (البقرة : ۱۶۵)

"اور وہ لوگ جو ایمان لا چکے ہیں اللہ کی محبت میں سب سے زیادہ سخت ہیں"۔

اس کے برعکس اگر آٹھ محبتوں والا پلڑا بھاری نکلا اور اللہ کی محبت' اس کے رسول کی محبت اور جہاد فی سبیل اللہ کی محبت ہلکی نکلی تو معاملہ بڑا خطرناک اور افسوس ناک ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا : ﴿ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ﴾ کہ جاؤ دفع ہو جاؤ اور اس وقت تک انتظار کرو جب تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ تمہارے بارے میں نہ سنادے۔ اور اللہ تعالیٰ اس قسم کے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس کے بعد غور طلب مقام یہ ہے کہ آخرت میں منافقوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو گا۔ اس کا ذکر قرآن حکیم نے بہت ہی سبق آموز انداز میں کیا ہے۔ پہلے سچے اہل ایمان کا خوش کن انجام بیان فرمایا :

﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ ﴾ (الحدید : ۱۲)

"جس دن تم مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے داہنی طرف اور آگے دوڑتا ہو گا' اس روز ان کے لئے جنت کی بشارت ہے جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی بڑی کامیابی ہے"۔

مخلص اور سچے اہل ایمان کے اس قابل رشک انجام کے تذکرے کے بعد منافقین کے انجام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

﴿ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ ﴾ (الحدید : ۱۳)

"جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گے کہ ذرا رکو' انتظار کرو ہم بھی تمہارے نور سے فائدہ اٹھالیں۔ (جواب میں اہل ایمان کہیں

گے) پیچھے لوٹ کر اپنا نور تلاش کرو۔ [۳] اب ان کے درمیان ایک فصیل حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا' جس کے اندر کی طرف رحمت خداوندی ہو گی اور باہر کی طرف عذاب ہو گا"۔

اتنا واضح انجام سامنے آ جانے کے بعد بھی منافقین بظاہر مغالطے میں ہی ہوں گے اور وہ دلیل پیش کریں گے : ﴿ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ﴾ اہل ایمان کو دور سے پکار کر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھی نہ تھے (دنیا میں ظاہری قانون کے اعتبار سے منافق بھی مسلمان ہی شمار کیا جاتا ہے)۔ اہل ایمان جواب میں ان پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے کہیں گے :

﴿ بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ○ ﴾

(الحدید : ۱۴)

"اس حد تک تو بات صحیح ہے (لیکن تم نے چار بنیادی جرم کئے تھے جن کی تفصیل یہ ہے کہ) تم نے اپنے آپ کو فتنوں [۴] کے اندر ڈالا اور تم انتظار میں رہے (کہ شاید مسلمان کسی مشکل میں پھنس جائیں اور تمہاری جہاد سے جان چھوٹے) اور تم شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گئے (حالانکہ ایمان اور شک و شبہ دو مختلف چیزیں ہیں) اور تمہیں تمہاری تمناؤں نے دھوکے میں ڈالے رکھا' اور اس بڑے دھوکے باز (شیطان) نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے میں رکھا"۔

اگلی آیت میں منافقوں اور کافروں کا آخری و حتمی انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا :

---

(۳) گویا کہ یہ نور یہاں سے نہیں ملا بلکہ دنیا سے کما کر لایا گیا ہے۔ یعنی جو نورِ ایمان اور نورِ اعمال دُنیا میں کمایا تھا یہاں آ کے ظاہر ہوا ہے۔ فریقین کے اسی مکالمے کے دوران اہل ایمان آگے نکل جائیں گے اور منافقین ان کا منہ تکتے پیچھے رہ جائیں گے۔ (ماخوذ)

(۴) مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہو کر ایمان کے تقاضے اور مطالبے بھول گئے جبکہ اللہ تعالیٰ نے پیشگی مطلع کر دیا تھا کہ ﴿ اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ﴾ کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے سامان آزمائش ہے۔

﴿ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۭ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (الحدید : ۱۵)

”آج کے دن نہ تم سے کوئی فدیہ قبول ہوگا اور نہ کافروں سے' تمہارا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے۔ یہ آگ ہی تمہاری رفیق ہے' اور یہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔“

دنیا میں ظاہری قانون کے اعتبار سے منافق مسلمانوں کے ساتھ شمار ہوتے تھے کیونکہ بظاہر وہ مسلمان تھے لیکن آخرت میں ان کا شمار کافروں میں ہوگا' اس لئے کہ اپنی بداعمالیوں کے سبب سے وہ اپنی ایمان کی پونجی ضائع کر بیٹھے تھے اور اب ایمان کی بجائے نفاق ان کے دلوں میں راسخ ہو گیا تھا۔ لہٰذا ان کا انجام بھی کافروں کے ساتھ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفاق اور منافقانہ کردار سے محفوظ رکھے۔ دولت ایمان دنیا میں عطا کرے اور مرتے دم تک ایمان نصیب رہے اور آخرت میں اہل ایمان کے ساتھ حساب اور جنت میں داخلہ ملے۔ آمین یا ربّ العالمین!

شعوری اور غیر شعوری نفاق کا فرق

اہل علم نے نفاق کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے : عقیدے کا نفاق ——— اور عمل کا نفاق۔ عقیدے کا نفاق شعوری بھی ہو سکتا ہے اور غیر شعوری بھی۔

شعوری نفاق :

کوئی شخص جان بوجھ کر دھوکہ دینے کے لئے ایمان کا اظہار کرے۔ مثلاً کوئی ہندو یا سکھ جاسوس بن کر پاکستان میں آئے اور اسلام کا لبادہ اوڑھ لے۔ پنجاب کے سرحدی دیہاتوں سے ایسی خبریں آتی رہتی ہیں کہ کسی گاؤں کی مسجد میں ہندو جاسوس امام مسجد کے بھیس میں امامت کرواتا رہا۔ ظاہر بات ہے وہ باریش ہوگا' اسلام کے عبادات و عقائد سے واقف ہوگا' عین ممکن ہے اس نے ختنہ بھی کروایا ہو۔ لیکن وہ آدمی خوب جانتا ہے کہ وہ کون ہے' کس عقیدے کا مالک ہے اور اب کس بھیس میں ہے۔

اس طرح کے شعوری منافقوں پر مشتمل ایک جماعت دورِ نبویؐ میں بھی موجود

تھی۔ قرآن حکیم اس کی تصدیق کرتا ہے :

﴿ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ۝ ﴾

(آل عمران:۷۲)

"اہل کتاب (یہودیوں) کی ایک جماعت نے یہ سازش تیار کی کہ صبح کے وقت ایمان لے آؤ اور شام کو مرتد ہو جاؤ' شاید کہ (سچے اہل ایمان میں سے بھی کچھ) لوگ پلٹ آئیں"۔

یہ یہودیوں کا سازشی ذہن تھا (جو کہ پوری دنیا میں مسلّم ہے) انہوں نے سازش تیار کی تاکہ کچھ مخلصین کو توڑا جاسکے۔ کیونکہ اس وقت ایمان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ جو ایک دفعہ ایمان لے آئے واپس نہیں جاتا چاہے اس کے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس دھاک کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے یہ سازش تیار کی۔

پس منظر میں موجود کرداروں اور مذکورہ واقعے پر غور کرنے سے یہ شکل سمجھ آتی ہے کہ کچھ لوگ صبح کے وقت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' اسلام کا اعلان کیا' سارا دن آپ ؐ کی محفل میں بڑے مؤدب بن کر بیٹھے رہے' شام تک اسلام سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا۔ دیکھنے والوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ کچھ لوگ اسلام لائے اور باادب ہو کر محفل میں بیٹھے رہے 'یقیناً صدق دل سے اسلام کو قبول کیا ہو گا' شام کو مکر گئے اور کہنے لگے ہاں اسلام لا کر دیکھ لیا ہے' کچھ بھی نہیں ہے' بس دور کے ڈھول سہانے لگتے ہیں ـــــ اس سازش کے پیچھے کچھ مقاصد تھے۔ ظاہر بات ہے سارے مسلمان تو ایک جیسے مضبوط ایمان کے مالک نہیں تھے ؏ "خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد"۔ چنانچہ کچھ تازہ اہل ایمان جن کے دلوں میں ایمان ابھی محکم نہ ہوا ہو' ممکن ہے کہ اس طرح کی سازش کا شکار ہو جائیں اور ان کے دل ڈول جائیں۔ ایسی ہی صورت حال کا نقشہ قرآن حکیم میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے :

﴿ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ○ ﴾ (المائدۃ : ٦١)

"(اے مسلمانو!) جب یہ تمہاری محفل میں آئے تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ وہ (دلی) کفر کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور کفر کے ساتھ ہی نکل گئے' اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ چھپائے ہوئے ہیں"۔

یعنی ان کی نیت ہی خراب تھی' ارادہ سازش کا تھا۔ اب آپ خود اندازہ کریں جو شخص صبح آٹھ بجے ایمان لاکر رات کو آٹھ بجے مرتد ہوا' اس نے بارہ گھنٹے اسلام کی حالت پر بسر کئے' ہو سکتا ہے چار نمازیں بھی رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں پڑھی ہوں' ان اوقات میں اگر وہ مرجاتا تو قانوناً مسلمان ہی شمار ہوتا اور آپ ﷺ اس کی نماز جنازہ بھی پڑھاتے' حالانکہ درحقیقت وہ دلی کفر کے ساتھ ہی داخل ہوا تھا اور کفر کے ساتھ ہی نکل گیا۔ وہ شخص اپنے بارے میں خوب جانتا تھا کہ میں دھوکہ دے رہا ہوں۔ یہ ہے شعوری نفاق یا بالارادہ نفاق۔

غیر شعوری نفاق :

قرآن حکیم میں جن منافقین کا تذکرہ آیا ہے ان میں ۹۹ فیصد یا کم سے کم ۹۰ فیصد لوگ غیر شعوری منافق تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جب بھی ان کا تذکرہ کرتا ہے تو "لَا يَشْعُرُوْنَ" اور "لَا يَعْلَمُوْنَ" کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ○ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○ ﴾ (البقرۃ : ۹)

"بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں' حالانکہ وہ درحقیقت مؤمن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور اہل ایمان کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں مگر دراصل وہ اپنے آپ کو ہی دھوکے میں

ڈال رہے ہیں اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔"

قرآن حکیم میں جن منافقین کا تذکرہ ہے ان کی اکثریت غیر شعوری نفاق کی حامل تھی۔

غیر شعوری نفاق کی بنیاد :

انسان کے اندر ایک فیکلٹی ہے جسے انگریزی زبان میں rationalization کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک مجرم جرم کر رہا ہوتا ہے تو وہ ساتھ ساتھ اپنے آپ کو مطمئن (justify) بھی کر رہا ہوتا ہے۔ ایک کارخانہ دار مزدور کا استحصال کر رہا ہوتا ہے اور اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے کہتا ہے کہ چونکہ مزدور دل لگا کر محنت سے کام نہیں کرتا لہٰذا مجھے اس کا حق مارنے کا استحقاق ہے۔ دوسری طرف مزدور کارخانہ دار کی چوری کرتا ہے اور اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے کہتا ہے کہ چونکہ مالک ہمارا استحصال کرتا ہے' ہمارا خون چوستا ہے' لہٰذا چوری کرنے کا مجھے حق ہے۔ اسی نفسیاتی اصول کے تحت عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدانِ احد سے واپس ہوا تھا کہ جب آپ ؐ ہماری بات نہیں مانتے' ہمارا مشورہ نہیں سنتے' تو ہم خواہ مخواہ اپنے آپ کو خطرے میں کیوں ڈالیں؟

﴿ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ (آل عمران : ۱۵۴)

"وہ کہتے ہیں کیا اس اہم معاملے میں ہمارا بھی کوئی حصہ تسلیم ہے؟"

اور پھر کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو "مَا قُتِلْنَا هٰهُنَا" "تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے"۔

نفاق سامنے کب آتا ہے؟

جس معاشرے میں دعوت و تحریک نہیں ہوتی اور جمود (stagnation) ہوتا ہے تو وہاں ایمان کا بھی جمود ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان کا ایمان زیرو لیول پر ہے تو وہیں پڑا رہے گا۔ جونہی وہاں دعوت و تحریک کا آغاز ہوگا امتحان و آزمائش کا مرحلہ بھی

شروع ہو جائے گا۔ صورت حال یوں بنتی ہے کہ اللہ بھی پیارا ہے' رسول اور جنت سے بھی پیار ہے' دوسری طرف جان و مال بھی پیارے ہیں اور گھر کا آرام بھی پیارا ہے۔ گویا ؎

تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری

اَب ایمان میدان کی طرف پکار رہا ہے۔ اگر ایمان کے تقاضے پر لبیک کہا تو ایمان کی ترقی و اضافے کی طرف سفر شروع ہو جائے گا ــــ جبکہ دوسری طرف علائق دُنیوی انسان کو رکنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ پاس بیٹھے رہو اور بہانہ بنا دو' یا جھوٹ بول دو' بلکہ ضرورت پڑے تو قسمیں کھا کر اس آزمائش سے خود کو بچالو ــــ بس ایسے ہی موقع پر نفاق نکھر کر سامنے آجائے گا۔

نفاق عملی یا عمل کا نفاق :

بعض احادیث میں کچھ اعمال کے حوالے سے نفاق کا تذکرہ ہوا ہے اور بعض اعمال کو نفاق کی علامات قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلاثٌ : اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ' وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ' وَاِذَا اؤتُمِنَ خَانَ)) (۵)

''منافق کی تین نشانیاں ہیں : (۱) جب بات کرے جھوٹ بولے' (۲) جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے' (۳) امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔''

مسلم شریف کی روایت میں اضافی الفاظ ہیں اور وہ بہت سخت ہیں :

((وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ)) (۶)

---

(۵) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب علامۃ المنافق' ح ۳۳۔ ۳۴

(۶) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب خصال المنافق' ح ۵۸۔ ۵۹

"خواہ وہ شخص روزے رکھتا ہو' نماز پڑھتا ہو اور اپنے تئیں پورا یقین رکھتا ہو کہ وہ مؤمن ہے"۔

ایک روایت میں چار نشانیاں بھی بیان ہوئی ہیں' تین سابقہ کے بعد چوتھی نشانی یہ بیان ہوئی کہ : ((وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ))(۷) "اور جب جھگڑا ہو جائے تو بے ہودہ زبان استعمال کرے (گالی گلوچ پر اتر آئے)"

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا : جس میں ان میں سے ایک نشانی پائی جائے وہ ایک چوتھائی (۱/۴ یا ۲۵ فیصد) منافق ہے' جس میں دو نشانیاں پائی جائیں وہ آدھا (۱/۲ یا ۵۰ فیصد) منافق ہے اور جس میں تین نشانیاں پائی جائیں وہ تین چوتھائی (۳/۴ یا ۷۵ فیصد) منافق ہے۔ چونکہ یہاں نفاق کا لفظ اعمال کی وجہ سے آیا ہے لہٰذا اہل علم نے اسے عملی نفاق قرار دیا ہے یا کردار و اخلاق کے نفاق کا نام دیا ہے۔ البتہ عقیدے کا نفاق اس وقت ہو گا جب اس کے دل میں فتور ہو اور نیت کی خرابی ہو۔

نفاق سے متعلق مغالطے اور وضاحتیں

نفاق کے ضمن میں بڑے بڑے مغالطے ہمارے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں' حتیٰ کہ پڑھے لکھے لوگ اور علماء کہلانے والے بھی ان مغالطوں کا شکار ہیں :

پہلا مغالطہ :

"نفاق صرف دورِ نبوت میں تھا' اب اس کا وجود نہیں ہے۔"

وضاحت :

اس حد تک تو یہ بات صحیح ہے کہ ہمارے اس دَور میں کسی کا نام لے کر اسے منافق نہیں کہا جا سکتا' کون منافق ہے اور کون نہیں' اس کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ تو کر سکتے تھے کیونکہ آپ کے پاس وحی کا علم آتا تھا لیکن آپ کے بعد کوئی شخص کسی

---

(۷) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب خصال المنافق' ح ۵۸۔۵۹

دوسرے کو منافق قرار نہیں دے سکتا۔ وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعے (۸) سے راہنمائی ملتی ہے۔ ہوا یوں کہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر کچھ منافقوں نے رات کی تاریکی میں حضور اکرم ﷺ پر حملہ کر دیا۔ اس وقت آپ ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہے تھے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اس وقت آپ کے اونٹ کی نکیل پکڑ کر چل رہے تھے' بہر حال اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی اور حضرت حذیفہؓ نے بھی مقابلہ کیا' آپؐ بچ نکلے۔ منافقوں نے ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے' رات کی تاریکی تھی' حضرت حذیفہؓ تو نہ پہچان سکے' تاہم اس موقع پر آپ ﷺ نے حضرت حذیفہؓ کو بتایا کہ یہ فلاں فلاں منافق تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے دوسرے منافقین کے بارے میں بھی حضرت حذیفہؓ کو بتا دیا تھا اور ساتھ ہی سختی سے روک بھی دیا تھا کہ حذیفہ دیکھو یہ میرا راز ہے' کسی سے نہیں کہنا۔ اسی سے حضرت حذیفہؓ کا یہ لقب بن گیا : "صاحبُ سِرِّ النبی" کہ یہ نبی ﷺ کے رازدان ہیں۔ لہٰذا اب آپ ﷺ کے بعد کوئی کسی کو منافق قرار دینے کا مجاز نہیں کیونکہ نفاق کی کوئی Legal entity (قانونی حیثیت) نہیں ہے۔ واضح رہے کہ اتنا معلوم ہونے کے باوجود بھی آپ ﷺ نے یہ احتیاط برتی کہ اپنی حیات طیبہ میں چند ایک افراد کو چھوڑ کر کہ جن کی سرکشی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی' کسی کو منافق قرار دے کر اس کا تعلق امت سے (۹) منقطع نہیں کیا۔ بہر حال جزوی طور پر یہ بات صحیح ہے کہ دورِ نبوی کے بعد کسی کو معین طور پر منافق قرار نہیں دیا جا سکتا' البتہ جس طرح ایمان اور کفر ہمیشہ ساتھ رہیں گے اسی طرح نفاق بھی ہمیشہ رہے گا اور ریاکاری واخلاص بھی ہمیشہ رہیں گے۔ معاشروں میں نسبت وتناسب میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ دَورِ نبویؐ میں اگر نفاق ہو سکتا ہے تو ہمارے دور میں اس کا زیادہ امکان ہے' اس دور میں تو سوگنا زیادہ نفاق ہو سکتا ہے۔

---

(۸) البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ۹۲۲/۵ کے اہم واقعات بسلسلہ غزوۂ تبوک۔

(۹) یہاں تک کہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی علیہ ما علیہ کی نماز جنازہ پڑھائی کیونکہ اس کے نوجوان بیٹے عبد اللہ بن عبد اللہ بن ابی مؤمن صادق تھے اور انہوں (باقی اگلے صفحہ پر)

دوسرامغالطہ :

"ہم تو مسلمان ہیں' نفاق کا ہم سے کیا سروکار؟ گویا کہ ہم ہر اعتبار سے محفوظ ہیں' بلکہ قلعہ بند ہیں' ہمیں تو نفاق چھو کر بھی نہیں جاسکتا۔"

وضاحت :

ہماری غلط فہمی یا خوش فہمی کا تقابل اس امر سے کر کے دیکھ لیں کہ کبارِ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اپنے بارے میں نفاق کے اندیشہ میں مبتلا رہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ (صاحب سر النبی) کو قسم دے کر پوچھا کہ کہیں میرا نام تو منافقین کی اس لسٹ میں نہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بتلائی؟۔ ذرا غور کریں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو اندیشہ نفاق لاحق ہے اور ہم بے فکر ہیں۔ حضرت حنظلہ بن ربیع الکاتب الاسیدی ایک انصاری صحابی ہیں۔ وہ گھر سے نکلے' ایک عجیب غلبہ حال کی کیفیت طاری تھی' چلے جارہے تھے اور رو رہے تھے۔ حضرت ابو بکر الصدیق رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے تو انہوں نے دریافت کیا کہ کیا ہوا۔ کہنے لگے "نافَقَ حنظلة" (حنظلہ منافق ہو گیا) پوچھا کیسے منافق ہو گئے' کہنے لگے : جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

(گزشتہ سے پیوستہ) نے درخواست کی کہ میرے والد انتقال کر گئے ہیں' آپ اپنا کرتہ عنایت کر دیں' ان کو کفن دینا چاہتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کرتہ دے دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ کس کو کرتہ دے رہے ہیں؟ فرمایا : عمر! میرا کرتہ اسے عذاب سے نہ بچا سکے گا۔ البتہ کرتہ نہ دینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مروت و شرافت کے خلاف تھا۔ بلکہ مجھے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح حضور نے قرض اتارا تھا' کیونکہ غزوۂ بدر کے اسیروں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بھی شامل تھے۔ وہ گرفتار ہو کر کافروں کے ساتھ ہی آئے تھے' اب حالت اسیری میں انہیں کرتے کی ضرورت پڑ گئی۔ وہ بہت طویل القامت تھے۔ حضرت عباس کے قد کے برابر عبداللہ بن ابی تھا۔ لہٰذا عبداللہ بن ابی نے اپنا کرتہ حضرت عباس کو دیا۔ اب گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ عبداللہ بن ابی کی خاطر دے کر اس قرض کو برابر کیا تھا۔ واللہ اعلم۔ (ماخوذ از محاضرات حقیقت ایمان)

میں ہوتے ہیں اور آپ ؑ جنت دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اور جب گھربار اور کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں تو وہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔ یہ فرق نفاق ہی تو ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اگر چاہتے تو خود ہی انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے مگر انہوں نے کہا : حنظلہ یہی حال ہمارا بھی ہے' رسول اللہ ﷺ کے پاس چل کر دریافت کرتے ہیں۔ ماجرا جاننے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا : اے حنظلہ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے' یہ تو عین ایمان ہے۔ میری مجلس میں تمہاری جو کیفیت ہوتی ہے اگر وہ مسلسل رہے تو فرشتے تم سے تمہارے بستروں میں مصافحہ کرنے لگیں اور اے حنظلہ ایسی گھڑی تو کبھی کبھی نصیب ہوتی ہے[۱۰]

اب موازنہ کر لیجئے کہ ہم تو اپنے آپ کو نفاق کے روگ سے محفوظ اور مامون سمجھے بیٹھے ہیں جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں جہاں منافقین کا ذکر آیا ہے ہمارا سرے سے ان سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں' ہمارے ہاں تو اپنے گریبان میں جھانکنے کی نوبت بھی کبھی نہیں آتی' ڈر' خوف اور لرزہ طاری ہونا تو دور کی بات ہے۔ اس ضمن میں اس مشہور قول سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے : "مَا اَمِنَهُ اِلاَّ مُنَافِقٌ وَمَا خَافَهُ اِلاَّ مُؤْمِنٌ" یعنی "نفاق سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا مگر منافق اور اس کے بارے میں خوف نہیں رکھتا مگر مؤمن"۔ [۱۱]

---

(۱۰) صحیح مسلم' کتاب التوبة' باب فضل دوام الذکر ..... الخ ح ۲۷۵۰ و سنن الترمذی' کتاب صفة القیامة' باب ۵۹' ح ۲۵۱۴۔ واضح رہے یہ الفاظِ حدیث کا ترجمہ نہیں ہے بس مفہوم حدیث اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

(۱۱) یہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے' ملاحظہ ہو صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب خوف المومن من ان یحبط عمله وھو لا یشعر۔ معروف تابعی ابن ابی ملیکہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں : "ادرکت ثلاثین من اصحاب النبی صلی الله علیه وسلم کلھم یخاف النفاق علی نفسه" (صحیح بخاری حوالہ سابقہ) "میں تیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملا ہوں' ہر ایک اپنے بارے میں نفاق کے خطرے میں مبتلا تھا"۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اسی بات کو ایک مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جس مسافر کی گٹھری میں مال ہو گا وہ رات کو چین سے نہیں سو سکے گا بلکہ ہمیشہ اندیشے میں مبتلا رہے گا اور جس کے پاس کچھ نہ ہو گا وہ پاؤں پسار کر سوئے گا۔ اور اگر کسی کا مال چوری ہو جائے اور ہاتھ خالی ہو جائیں تو وہ بھی پُر سکون سوئے گا۔ بقول غالب ؎

رہا کھٹکا نہ چوری کا' دُعا دیتا ہوں رہزن کو

چنانچہ جس کے پاس ایمان کی پونجی ہی نہیں اس کو کس چیز کا ڈر' ہاں البتہ جس کے پاس ایمان کا سرمایہ ہو گا اسی کو نفاق کے ڈاکے کا ڈر لگا رہے گا۔

(گزشتہ سے پیوستہ) امام ابن حجر رحمہ اللہ نے اس خوف اور خطرے کی تعبیر ان الفاظ میں کی ہے: "اس لئے کہ مؤمن پر کبھی اس طرح کے حالات طاری ہو جاتے ہیں جنہیں وہ اخلاص کے منافی خیال کرتا ہے' اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر انہیں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو) خطرہ محسوس ہو رہا تھا تو وہ فی الواقع اس میں مبتلا ہو گئے ہوں بلکہ ورع و تقویٰ میں مبالغہ و شدت کی وجہ سے انہیں یہ احساس تھا۔ (فتح الباری ۱۳۶/۱ طبع الریان' مصر) (اضافہ از مرتب غفر اللہ لہ ولوالدیہ)

بابِ ہفتم

حقیقتِ ایمان۔ متفرق مباحث

ایمان کے ثمراتِ ظاہری

ایمان سے مُراد یہاں حقیقی ایمان ہے۔ ایمان کے ثمراتِ ظاہری کو درخت کی مثال سامنے رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں پہلے دو پتیاں ہی پھوٹتی ہیں' پھر تنا بنتا ہے' اس تنے میں سے شاخیں نکلتی ہیں اور پھر پتے' پھول اور پھل نکلتے ہیں۔ جس قدر درخت اوپر کو اٹھے گا اسی اعتبار سے اس کی جڑ مضبوط ہوتی جائے گی۔ اسی طرح جتنا ایمان مضبوط ہو گا اسی اعتبار سے عمل صالح' تواصی بالحق' تواصی بالصبر' جہاد فی سبیل اللہ' ارکانِ اسلام' اطاعت' عبادت اور وفاو فدا کاری میں نکھار آتا چلا جائے گا۔ گویا کہ یہ سارے اعمال ایمان کے ظاہری برگ و بار ہیں۔ حدیث جبریل میں جو لفظ "احسان" استعمال ہوا ہے اس سے مُراد ایمان کے ثمراتِ ظاہری کا نقطۂ عروج ہے۔ ان اعمال میں جس قدر شدت' اخلاص اور عمدگی ہو گی اسی اعتبار سے درجۂ احسان میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ کیونکہ احسان کے معنی کسی کام کو عمدگی اور خوبصورتی سے ادا کرنے کے ہوتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے :

((وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَ))[1]

---

(۱) پوری حدیث اس طرح ہے :
((اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ ' فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَ ' وَلْیُحِدَّ اَحَدُکُمْ شَفْرَتَہٗ فَلْیُرِحْ ذَبِیْحَتَہٗ قَتَلْتُمْ))
"اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں عمدگی اور خوبصورتی کو فرض کیا ہے۔ چنانچہ جب کسی کو قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور اپنی چھری کی دھار کو تیز کر لو تاکہ جانور کو آرام سے ذبح کیا جا سکے"۔ (صحیح مسلم' کتاب الصید' باب ۱۱ و دیگر کتب حدیث)

"جب جانور کو ذبح کرنا ہو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو"۔

یعنی ہر کام بحسن و خوبی کرو' نماز پڑھو تو اچھی پڑھو۔ دین کے جو بھی کام ہیں ان میں خوبصورتی' حسن اور رعنائی ہونی چاہئے۔ حسن و خوبی کے ساتھ ساتھ ہر کام میں شدت اور گہرائی ہو۔ جہاد و مجاہدہ میں بھی اتنی ہی شدت ہو۔ ایثار و قربانی میں بھی شدت ہو۔ نماز میں بھی وہ کیفیت ہو کہ معراج المومن بن جائے۔ اسی کو شریعت میں احسان کا نام دیا گیا ہے اور حدیث جبریل (جس کا تذکرہ گزر چکا ہے) میں بھی احسان سے یہی کیفیت مُراد ہے۔

ایمان اور فطرت

ایمان کا اصل حاصل اور لب لباب امن ہے' اور امن سے مراد ذہنی و قلبی سکون و اطمینان ہے۔ یہ دو اعلیٰ ترین استعدادات (faculties) ہیں جو ہر انسان میں موجود ہیں جنہیں ہم دل و دماغ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو بھی الجھن ہوتی ہے' قلب کو صدمہ ہو' ذہن کو فکر ہو' اندیشے ہوں' سب کا تعلق انہی دو چیزوں سے ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جن کے یہ دونوں اعضاء (faculties) متحد ہوں اور ان کی شخصیت منقسم (split) نہ ہو کہ دل کچھ کہہ رہا ہو اور دماغ کچھ اور کہہ رہا ہو' بلکہ دل و دماغ کے اتحاد کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرۃ انہوں نے جو بھی راستہ اختیار کیا ہو وہ اسی پر گامزن ہوں۔

ایمان کے ذریعے ان تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے جن سے فلسفہ بحث کرتا ہے ــــــ مثلاً :

(۱) اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟

(۲) کیا یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی؟

(۳) کیا یہ خود بخود بن گئی ہے اور خود بخود چل رہی ہے؟ یا اسے کوئی بنانے اور چلانے والا ہے؟

(۴) اس سے ہمارا کوئی ربط و تعلق ہے یا ربط الحادث بالقدیم کا سا معاملہ ہے؟

(۵) اگر یہ کائنات حادث ہے اور اس کا خالق قدیم' تو ان کے مابین ربط و تعلق کیا ہے؟

(۶) ہماری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اور مبدأ و معاد کیا ہے؟[۲]

(۷) خیر کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ یہ کوئی مستقل اقدار (values) ہیں یا ہمارا خیال ہی ہے؟
(*Nothing is good or bad; only thinking makes it so.*)

(۸) علم کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ علم بالحواس اور علم بالعقل کو تو ہم جانتے ہیں' لیکن کیا اس سے وراء بھی کوئی ذریعہ علم (source of knowledge) ہے؟

(۹) انسان کے محرکاتِ عمل کیا ہیں؟ آیا صرف حیوانی جبلتیں ہی ہیں یا اس سے بالاتر بھی انسانی وجود کی کوئی حقیقت ہے؟

یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن سے فلسفے کی مختلف شاخیں مثلاً مابعد الطبیعیات (Metaphysics)' اخلاقیات (Ethics) اور نفسیات (Psychology) بحث کرتی ہیں۔

جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا ہے تب سے اہل دانش ان سوالات پر غور کرتے رہے ہیں۔ ہر دانشور نے اس کا world-view پیش کیا ہے۔ ایمان بھی

---

(۲) جیسے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی کتاب ہے "مبدأ و معاد"۔ یعنی جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ ہماری زندگی کے سفر کا آغاز کیا ہے اور اس کی آخری منزل کون سی ہے؟

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم!

تو اس کا منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ :

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم؟

اس کا نتیجہ Skepticism یا Agnosticism یعنی ارتیابیت یا لاادریت ہے۔

درحقیقت ایک مکمل تصورِ کائنات (world-view) یا فلسفے کی جرمن اصطلاح میں "Weltenschuong" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ایمان ہی وہ تصورِ کائنات ہے جو فطرت انسانی کے ساتھ کامل مطابقت رکھتا ہے۔ ایمان ہی کے ذریعے سکون، انبساط اور معرفت ملتی ہے، جس سے سارے مسائل کا حل سامنے آ جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی جان لیں کہ نور سے انسان کو سکون ملتا ہے اور اندھیرے سے بے چینی ملتی ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہو جائے تو آدمی بے چین ہو جاتا ہے، کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ آگے کون ہے اور پیچھے کون؟ اس کے برعکس روشنی میں سب معلوم ہو جاتا ہے کہ آگے کیا ہے؟ پیچھے کیا ہے؟ دائیں اور بائیں کیا ہے؟

حقیقی مؤمن ہونے کی صورت میں ذہنی و قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ قلب کو دو قسم کے احساسات درپیش ہوتے ہیں، ایک کیفیت خوشی، اطمینان، انبساط اور مسرت کی ہوتی ہے جبکہ دوسری کیفیت غم، رنج، صدمہ، کرب اور دکھ کی ہوتی ہے۔ آج کی نوجوان نسل میں "وجود کا کرب" نامی فلسفہ بہت مشہور ہو رہا ہے۔

دل میں اگر رنج والم ہو تو دماغ میں اندیشے اور تشویش پیدا ہوتی ہے، جس کی مختلف شکلیں ممکن ہیں، مثلاً فلاں جانور نقصان نہ پہنچادے، سانپ نہ کاٹ لے، فلاں افسر یا باس ناراض نہ ہو جائے۔ دل کے رنج وغم اور دماغ کے اندیشے اور تشویش کو قرآن نے حزن و خوف کا نام دیا ہے۔ جب امن ہو گا تو "خوف و حزن" نہیں ہو گا۔ اور ایمان کا لازمی نتیجہ "امن" ہے، یعنی زوالِ حزن و خوف۔ لہٰذا اگر کوئی انسان خوف و حزن سے نجات پالے اور اسے سکون و اطمینان مل جائے تو یہ اس کے قلبی ایمان کی نشانی ہے۔

ایمان اور تصوف

"تصوف" ایک مجہول النسب لفظ ہے۔ بہرحال مسلمانوں میں یہ اصطلاح

مشہور ہو چکی ہے اور ایک بڑے طبقے کے ہاں مقبول و معروف ہے۔ تصوف کا لفظ نہ تو قرآن حکیم میں ہے اور نہ ہی غالباً حدیث رسول اللہ ﷺ میں موجود ہے۔

لفظ تصوف کا وزن "تَفَعُّل" ہے' لیکن اس کا ثلاثی اصل کیا ہے؟ معلوم نہیں۔ کچھ لوگوں نے "تصوف" کا اصل "صوف" مانا ہے' یعنی اونی لباس' کیونکہ ابتداءً صوفیاء اپنے جسم کو تکلیف دینے اور نزاکت سے بچانے کے لئے اونی کپڑے استعمال کرتے تھے' غالباً یہی بات صحیح ہے۔ کچھ دوسرے حضرات نے "تصوف" کا اصل "صفا" قرار دیا ہے' لیکن ہماری معلومات کی حد تک "صفا" سے لفظ تصوف کسی شکل میں نہیں بنتا۔

قرآنی اصطلاح کے مطابق تصوف کا موضوع ولایت یا موالاتِ باہمی ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مولیٰ اور ولی ہے' فرمایا :

﴿ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾

(البقرة : ٢٥٧)

"جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے' وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے"۔

اسی طرح اہل ایمان بھی اللہ کے ولی ہیں۔ فرمایا :

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾

(یونس : ٦٢)

"سن لو! جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے"۔

تصوف کا مقصد

تصوف کا مقصد یہ ہے کہ ایمان انسان کے قال سے آگے بڑھ کر حال کی شکل اختیار کر لے۔ کسی کا زبان سے ایمان کا اقرار کرنا اور چیز ہے' لیکن ایمان انسان کے جسم پر ایک کیفیت کے ساتھ نظر آئے یہ دوسری چیز ہے اور یہی تصوف کا مقصد و منشا ہے۔

تصوف کا فلسفہ

مسلمانوں میں تصوف کے حوالے سے کچھ لوگ معروف ہوئے ہیں جیسے کندی، فارابی، ابن سینا، ابن رشد وغیرھم، لیکن یہ تمام حضرات ارسطو کے متبعین ہیں، انہوں نے ارسطو کی منطق کے حوالے سے دین کو سمجھنے کی کوشش کی، اور بڑی سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ فی زمانہ ان کے متبعین میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن (۳) کا نام بھی آتا ہے۔ "اصل میں مسلمانوں کے صحیح فلسفی صوفیاء ہیں" (۴) یہ جملہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا ہے (اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور ان کی کوتاہیوں کو معاف فرمادے) اگرچہ وہ صوفیاء کے کٹر دشمن تھے اور ان کے خیال میں تصوف کل کا کل ضلالت ہے۔ اتنے شدید اختلافات کے باوجود مولانا کو تسلیم تھا کہ اسلام کے اصل فلسفی صوفیاء ہی تھے۔ جہاں تک تصوف کا فلسفیانہ پہلو ہے تو وہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے، البتہ تصوف کا عملی پہلو "تزکیۂ نفس" اکثر لوگوں کو معلوم ہے۔

میرے نزدیک تاریخ انسانیت کے سب سے بڑے ماہرین نفسیات صوفیاء کرام تھے۔ جس طرح انہوں نے نفس انسانی کی گہرائیوں میں اتر کر مشاہدہ کیا ہے کہ حقائق کیا ہیں؟ انسان کے اندر کیا کچھ موجزن ہے؟ انسان کے نفس کے اندر کیسے کیسے

---

(۳) ڈاکٹر فضل الرحمٰن پاکستان میں بہت بدنام ہوئے۔ ان کے خلاف ۱۹۶۸ء میں ایجی ٹیشن بھی ہوا جو کہ ایوب کے زوال کا سبب بن گیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے وحی اور نبوت کا وہی تصور پیش کیا جو سابقہ فلاسفہ کا تصور تھا، بلکہ ان کی ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ بھی اسی موضوع Concept of Prophethood in Islam پر تھا۔ اہل سنت اور متکلمین اسلام کے نزدیک یہ کفر کا نیا ایڈیشن تھا، اس لئے ان کے خلاف بہت شدت سے تحریک چلی۔ (ماخوذ)

(۴) صوفیاء سے مراد آج کے بھنگی، چرسی، قبروں کے مجاور یا بازاروں میں ننگ دھڑنگ پھرنے والے ناتر العقل لوگ قطعاً نہیں، بلکہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدمت اسلام کی خاطر ہر طرح کی مشقتیں برداشت کیں اور تمام ممکنہ وسائل کے ذریعے کلمۃ الاسلام لوگوں تک پہنچایا۔ (ابو عبدالرحمٰن)

طوفان برپا ہیں؟ جدید مادہ پرست ماہرین نفسیات کی تو وہاں تک رسائی ہی نہیں۔

بے خدا فلسفہ

فلسفہ اور محض فلسفہ جس میں سارا دار و مدار منطق پر ہوتا ہے اور منطق جو ہمارے حواس اور معلومات پر مبنی ہے اس کی منطقی انتہاء (Logical climax or end) ارتیابیت یا لا آدریت ہے۔ للذا اگر کسی نے دلیلوں کے ذریعے اللہ کو ماننا ہے تو قطعاً اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

علامہ اقبال مرحوم نے اپنے پہلے خطبے میں کہا تھا کہ وجودِ باری تعالیٰ کے لئے جتنے بھی دلائل (arguments) دیئے گئے ہیں وہ سب ایک دوسرے کو کاٹ دیتے ہیں۔ دلیل، دلیل کو کاٹ دیتی ہے۔ منطق، منطق سے کٹ جاتی ہے۔ چنانچہ منطق اور دلائل سے آپ اللہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے لئے کچھ اور کام کرنے پڑتے ہیں جن کے ذریعے انسان کو نعمت یقین حاصل ہوتی ہے۔

تصوف کا میدان

تصوف میں جو چیزیں زیر بحث آتی ہیں وہ سلوک ہے، تقرب الی اللہ کی منزلیں طے کرنا ہے، وصول الی اللہ کے لئے آگے بڑھنا ہے، جس میں کئی مقامات اور منزلیں آتی ہیں : مقامِ صبر، مقامِ شکر، مقامِ محبت، مقامِ تسلیم و رضا اور مقامِ توکل و تفویض ــــــ بہرحال تصوف کا حاصل مرتبہ ولایت ہے جس کو قرآن حکیم نے ﴿رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً﴾ اور ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ کہا ہے۔ یعنی بندہ اللہ سے راضی، اللہ بندے سے راضی، بندہ اللہ کا دوست اور اللہ بندے کا دوست ــــــ اور دوستی بھی ایسی مثالی جس کا نقشہ حدیث قدسی میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اِنَّ اللّٰهَ قَالَ : مَنْ عَادٰى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ اَحَبَّ اِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ

يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ ' فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ : كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ ' وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ ' وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا ' وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا ' وَاِنْ سَاَلَنِيْ لَاُعْطِيَنَّهٗ ' وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِيْ لَاُعِيْذَنَّهٗ ' وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ تَرَدُّدِي عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ ' يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَكْرَهُ مَسَاءَتَهٗ))(۵)

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : "جس نے میرے کسی ولی (دوست) کے ساتھ دشمنی کی میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتا ہوں۔ جو کام میں نے اپنے بندے پر فرض کر رکھے ہیں ان سے زیادہ کسی دوسرے ذریعے سے میرا بندہ میرا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ تاہم بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب میں اس کو اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کی ٹانگ بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دیتا ہوں۔ اور میں کسی کام میں بھی اتنے تردد سے کام نہیں لیتا جتنا تردد مجھے مؤمن کی جان نکالنے کے بارے میں ہوتا ہے۔ مؤمن کو موت ناپسند ہوتی ہے اور میں بھی اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا"۔

یہ مرتبۂ ولایت ہے' جس کے نتیجے میں انسان اسلام اور اس کے بعد ایمان کی منزلیں طے کر کے مرتبۂ احسان پر فائز ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مرتبۂ ولایت ایمان میں گہرائی کا نتیجہ ہے۔ ایمان کی گہرائی ' گیرائی ' شدت اور قوت کی وجہ سے وہ انسان کا حال بن جاتا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو گی تو بندے کی اطاعت ' دلی کیفیت ' فطرت ' اللہ کے لئے فدائیت و فدویت آسمان کو چھونے لگے گی۔ گویا کہ وہ ﴿ اَصْلُهَا ثَابِتٌ

(۵) صحیح البخاری ' کتاب الرقاق ' باب التواضع ' ح ۶۱۳۷

﴿ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴾ کا عملی نمونہ پیش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایمان کی مثال درخت سے اس لئے دی ہے کہ درخت جس قدر اونچا ہوتا جاتا ہے اسی اعتبار سے اس کی جڑ زمین میں گہری اور مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ یہ مقابلے میں دو طرفہ عمل ہے۔ جس قدر جڑ نیچے گہری ہوگی اسی اعتبار سے برگ وبار اوپر نظر آئیں گے اور جس قدر درخت کا ظاہری پھیلاؤ زیادہ ہوگا اسی اعتبار سے اس کی جڑ زمین میں گہری ہوگی۔ اگر ایمان جڑ کا حکم رکھتا ہے تو برگ وبار اور شاخیں نیک اعمال کا مقام رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے مرتبۂ ولایت اور احسان میں کوئی فرق نہیں، لیکن پوشیدہ جڑ اور ظاہری شاخوں اور پتوں کا اپنا علیحدہ علیحدہ مقام ہے۔

تقدیر پر ایمان

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا لازمی خاصہ تقدیر پر ایمان ہے۔ انسان تسلیم و رضا کا خوگر بن جائے، یعنی راضی برضائے رب رہے۔ وہ اس بات پر یقین کر لے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، چاہے اس میں مادی اسباب و علل کتنے ہی کیوں نہ ہوں، لیکن مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ باذنِ ربی ہو رہا ہے، لہٰذا جو کچھ میرے رب کی طرف سے آئے اس پر کیا شکوہ وشکایت؟ کیا رنج؟ کیا غم؟ یقیناً اسی میں میری خیر ہے۔ میں تو کوتاہ نظر ہوں، میں تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ میری بھلائی کس میں ہے۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

﴿ وَعَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(البقرۃ : ۲۱۶)

"ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو، اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

تو معلوم ہوا کہ راضی برضائے رب رہنا در حقیقت تسلیم و رضا کا نام ہے۔ ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی!

اسی کا منطقی نتیجہ یا تصویر کا دوسرا رخ "توکل اور تفویض" ہے۔

رضا و توکل میں فرق

رضا کا تعلق اس نتیجے پر ہے جو ہم پر وارد ہو رہا ہے' یعنی جو بھی حالات آ رہے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلاَّ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (التغابن)

"کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن سے ہی آتی ہے"۔

اس کے بالمقابل جو اعمال' بھاگ دوڑ' سعی' جدوجہد اور تگ و دو ہم سے صادر ہو رہے ہیں ان کے نتائج پر اطمینان توکل کہلاتا ہے۔ سارے اسباب و وسائل موجود ہوں لیکن جب تک اللہ نہ چاہے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ مثلاً آپ کو کل کہیں جانا ہے' گاڑی اے ون حالت میں ہے' پٹرول وغیرہ بھی ٹھیک ہے' اگر آپ نے کہہ دیا کہ میں کل ضرور وہاں جاؤں گا تو آپ اللہ کو بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت و اذن درمیان میں یاد نہیں رہا۔

معرفتِ رب کے مقامات

امام رازیؒ نے معرفتِ رب کے تین مقام بیان کئے ہیں :

① معرفتِ رب کا بلند ترین مقام تو یہ ہے کہ ہر شے سے پہلے اللہ نظر آئے۔

② درمیانی مقام یہ ہے کہ ہر شے کے ساتھ اللہ نظر آئے۔

③ اس کا ادنیٰ مقام یہ ہے کہ واقعے کے بعد اللہ یاد آجائے۔

ذرا غور کریں کہ ہمیں تو نہ اللہ نظر آتا ہے نہ یاد آتا ہے' بس ظاہری عوامل پر غور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا واقعات و حادثات کے نتیجے میں ایمان بیدار ہوتا ہے نہ توکل

پیدا ہوتا ہے۔

توکل کا صحیح مفہوم

عام طور پر توکل کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جاؤ۔ یہ توکل نہیں ہے۔ بلکہ پوری طرح محنت کرنا ضروری ہے' جیسا کہ قرآن حکیم دشمن کے خلاف وسائل حرب تیار رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ فرمایا :

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ . . . ﴾

(الانفال : ۶۰)

"اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لئے تیار رکھو۔"

کسی شاعر نے اس شعر میں توکل کا سارا مفہوم ومدعا بیان کر دیا ہے ؎

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
نتیجہ اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

مگر تمام اسباب وذرائع کے ہوتے ہوئے کبھی یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان وسائل کی وجہ سے نتیجہ بر آمد ہو جائے گا' بلکہ وہی ہو گا جو اللہ چاہے گا' "مَاشَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَاْ لَمْ يَكُنْ" یعنی جو اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہو گیا اور جو نہ چاہا وہ نہیں ہو سکا۔ مثلاً آپ نے کسی کام کے لئے بڑی محنت و کوشش کی' عرصہ دراز تک تگ و دو کرتے رہے مگر وہ نہ ہو پایا۔ اور کسی وجہ سے موقع ہاتھ سے نکل گیا تو جس آدمی کے دل میں توکل نہ ہو گا اس کا حال یہ ہو گا کہ رنج و غم اور صدمہ لئے بیٹھا ہے کہ اتنی محنت کی' پیسہ خرچ کیا' سفارشیں لڑوائیں' لوگوں کی خوشامد کر کے اپنی عزت کو برباد کیا' سب کچھ کر کے دیکھ لیا مگر کام نہیں بنا۔ لیکن اگر ایمان بالقدر موجود ہو اور بالخصوص توکل دل میں سمایا ہوا ہو تو ایسی صورت میں نہ کوئی پریشانی ہو گی اور نہ خلافِ توقع نتائج پر رنج و اَلم ہو گا۔ ایک حدیث سے اس ضمن میں واضح راہنمائی ملتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ :

كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَوْمًا ' فَقَالَ لِي : ((يَا غُلَامُ ' اِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ ' اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ ' اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ ' اِذَا سَاَلْتَ فَاسْاَلِ اللّٰهَ ' وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ ؛ وَاعْلَمْ اَنَّ الامَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ ' وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَّضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ ' رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ)) (۶)

میں ایک روز رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا۔ آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا : "اے نوجوان! میں تمہیں کچھ باتیں سکھانا چاہتا ہوں' اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہاری حفاظت فرمائے گا' اللہ کو یاد رکھو تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے' جب مانگو تو اللہ سے مانگو' جب مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو' اور یہ بات اچھی طرح جان لو کہ اگر تمام لوگ مل کر تمہیں کوئی نفع دینا چاہیں تو صرف اتنا ہی نفع دے پائیں گے جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اور اگر سارے انسان مل کر تمہیں کچھ نقصان پہنچانا چاہیں تو صرف اتنا ہی نقصان دے سکیں گے جتنا اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھائے جا چکے ہیں اور رجسٹر خشک ہو چکے ہیں"

اسی حدیث میں آیا ہے کہ :

((وَاعْلَمْ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَاَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ)) (۷)

---

(۶) سنن الترمذی' کتاب صفة القیامة' باب ۵۹' ح ۲۵۱۶۔ امام ترمذی نے حدیث کو "حسن صحیح" قرار دیا ہے۔ و مسند احمد ۱/ ۲۹۳ ح ۲۶۶۹ و ح ۲۷۶۳۔ (مسند عبداللہ بن عباس) استاذ احمد شاکر نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔

(۷) مسند عبد بن حمید' ص ۲۱۴' ح ۶۳۶۔ اور یہ روایت المثنی بن الصباح راوی کی وجہ سے ضعیف ہے' ملاحظہ ہو مختصر الکامل لابن عدی' ص ۷۴۰۔ حالاتِ زندگی نمبر ۱۹۰۲۔

"اور یہ بات اچھی طرح جان لو کہ جو چیز تمہیں مل چکی ہے وہ کبھی تم سے خطا نہیں ہو سکتی تھی اور جو تمہیں نہیں ملی ہے وہ کبھی تمہیں مل نہیں سکتی تھی"۔

انسان کو مایوسی اور frustration سے بچانے والی شے تسلیم و رضا کی خو ہے۔ سارے نفسیاتی امراض جنہیں ہم دماغی امراض بھی کہتے ہیں frustration کا نتیجہ ہیں اور ان سب کا ازالہ یقین محکم اور ایمان بالقدر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ :

((اَنَّ كَلِمَةَ لَو تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ)) (۸)

"لفظ "لَوْ" (اگر) سے شیطان کا کام شروع ہو جاتا ہے۔"

یعنی یہ کہنا کہ اگر میں یوں کرتا تو یہ ہو جاتا اور اگر اس طرح کرتا تو یہ نتیجہ نکل آتا' اس سے شیطان کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ ذرا غور کریں کہ تمہاری مرضی کے مطابق نتیجہ کیسے نکل آتا؟ جو اللہ کا فیصلہ تھا وہی نتیجہ نکلنا تھا' لہٰذا تمہاری یہ سوچ ایمان کے منافی ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر ذرا غور کریں کہ اگر انسان پر ایمان کے حقائق منکشف ہو جائیں' اس کے دل میں راسخ ہو جائیں' بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کا حال بن جائیں تو اس کے بعد کیسا رنج اور کیسا خوف؟ خوف اسی وقت ہوتا ہے جب غیر مطلوبہ نتائج کا خطرہ ہو' لیکن جب یقین ہو جائے کہ جو اللہ چاہے گا وہی ہو گا' کسی کے ہاتھ میں نہ میری برائی ہے اور نہ اچھائی ہے تو پھر انسان کیونکر کسی کے سامنے ذلیل ہو گا؟ کیونکر کسی کی خوشامد کرے گا؟

اب تسلیم و رضا اور تفویض و توکل کو ایک جگہ جمع کر لیں تو نتیجہ نکلے گا "ایمان بالقدر" ـــــــ جو ہمارے ایمانیات کا اہم اور لازمی جزو ہے۔ حدیث جبریل میں آیا ہے: ((اَنْ تُؤْمِنَ بالقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ)) "اور یہ کہ تم اچھی اور بری تقدیر پر ایمان لاؤ"۔

---

(۸) صحیح مسلم' کتاب القدر' باب فی الامر بالقوۃ و ترک العجز' ح ۲۶۶۴

ایک مغالطہ اور اس کی وضاحت

مغالطہ : تقدیر کے ضمن میں آج کل ایک خاص قسم کا عقلیت پسندانہ (rationalistic) اندازِ فکر اختیار کیا جاتا ہے کہ تقدیر کے موضوع کو بند ہی رکھو' یہ ذرا مشکل موضوع ہے اور یہ ایک معمہ ہے۔ کیونکہ جونہی تقدیر کا لفظ ہمارے سامنے آتا ہے جبریت (predeterminism) کا تصور آجاتا ہے اور اگر جبریت کو صحیح مان لیا جائے تو پھر حساب کیسا؟ جزا و سزا کس چیز کی؟ اگر کوئی نیکی یا بدی مجبوراً کر رہا ہے تو بدلہ کیوں؟

وضاحت : دراصل ایمان بالقدر اللہ تعالیٰ کی دو صفات پر پختہ ایمان و یقین کا لازمی نتیجہ ہے :

(۱) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی اس کی قدرت ہر چیز پر غالب ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا علم تمام اشیاء کا احاطہ کئے ہوئے ہے کہ ماضی و مستقبل کا کوئی کام اس کے علم سے باہر نہیں۔

اس ضمن میں درج ذیل آیات پر ایک نگاہ ڈال لیں :

(۱) ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌO ﴾ (۹)

"اللہ تعالیٰ ہر چیز پر کامل قدرت رکھنے والا ہے"۔

(۲) ﴿ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌO ﴾ (حٰمٓ السجدۃ : ۵۴)

"آگاہ رہو اس کی ذات ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے"۔

(۳) ﴿ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًاO ﴾ (النساء : ۱۲۶)

"اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے"۔

(۴) ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًاO ﴾ (الطلاق : ۱۲)

---

(۹) قرآن حکیم میں یہ حقیقت ۳۹ مرتبہ بیان ہوئی ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے علم کے اعتبار سے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے"۔

(۵) ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ ﴾ (آل عمران : ۱۲۰)

"جو کچھ یہ کر رہے ہیں یقیناً اللہ نے اس کا بھی احاطہ کیا ہوا ہے"۔

احاطۂ قدرت اور احاطۂ علم کو سمجھ لینے سے تقدیر کا عقدہ حل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ پیشگی علم (fore-knowledge) جبریت (predetermination) کو مستلزم نہیں ہے۔ اگر کسی چیز کا آپ کو علم ہو گیا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اگر وہ شے ہو رہی ہے تو آپ کے جبر کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ ان دونوں کو علیحدہ کر لیں تو بات سمجھ میں آجائے گی۔

سادہ ترین مثال ہے کہ آپ کسی بچے کے سامنے خوشنما اور خوبصورت کھلونا رکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ بچہ لامحالہ اس کی طرف متوجہ ہو گا اور آپ کا اندازہ صحیح ثابت ہو گیا۔ لیکن کیا بچے نے آپ کے جبر کے تحت اس کھلونے کی طرف توجہ کی؟ یا صرف آپ کا اندازہ تھا جو عملاً صحیح ثابت ہوا؟ اور ہمارا اندازہ صحیح بھی ثابت ہو سکتا ہے اور غلط بھی، لیکن اللہ کا علم کبھی غلط نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کون کس وقت کیا کرے گا یہ اللہ کو پیشگی معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کفر و ایمان دونوں کے اختیار میں آزادی دے رکھی ہے۔ فرمایا :

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (الکہف : ۲۹)

"اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔"

معلوم ہوا کہ انسانوں کو اختیار تو ہے البتہ اللہ تعالیٰ کو بخوبی علم ہے اور اللہ کا علم غلط نہیں ہو سکتا۔ اور ہو گا وہی جو اللہ کے علم میں ہے۔ اگر آپ fore-knowledge کو predetermination سے علیحدہ کر دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن یہ جان لیجئے کہ بہرحال تقدیر پر ایمان، ایمانیاتِ اسلام کا لازمی جزو ہے۔ اس لئے کسی بھی جدید فکر یا رجحان کی وجہ سے آنکھیں بند کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

توکل و تفویض اور اس کے نفسیاتی ثمرات

ہر مسلم و مؤمن کا ایمان اس کیفیت کا ہونا چاہیے کہ محنت ضرور کرے لیکن نتائج کے بارے میں کہے :

﴿ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ ﴾

(المومن : ۴۴)

"اور اپنا معاملہ میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں' یقیناً وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔"

اور اللہ کا جو فیصلہ ہو گا میں اس پر راضی ہوں۔ ٹھیک ہے میں محنت کر رہا ہوں' اپنے فرائض ادا کر رہا ہوں' بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ جو کچھ آپ کر سکتے ہیں وہ تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا' لیکن اس کے بعد نتائج کے بارے میں توکل اللہ کی ذات پر ہو نہ کہ وسائل و اسباب پر۔ چنانچہ فرمایا :

﴿ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل : ۲)

"کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل (کارساز) نہ بنانا"۔

تفویض میں اس قدر سکون و اطمینان ہے کہ نہ کوئی تشویش نہ کوئی چنتا۔ معاملہ اللہ کے سپرد کیا اور مطمئن ہو گئے۔ کسی فارسی شاعر نے اس مفہوم کو بہت خوبصورتی کے ساتھ ایک شعر میں سمو دیا ہے۔ ؎

کارسازِ ما بہ فکر کارِ ما   فکر ما در کارِ ما آزارِ ما

اس شعر کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اس حدیث پر غور کر لیں تو بات بن جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((مَنْ کَانَ فِیْ حَاجَةِ اَخِیْهِ کَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ)) [۱۰]

---

(۱۰) صحیح البخاری' کتاب المظالم' باب لایظلم المسلم المسلم ولا یسلمه' ح ۲۳۱۰۔ وصحیح مسلم' کتاب البر و الصلة' باب تحریم الظلم' حدیث ۲۵۸۰۔ وسنن الترمذی' کتاب الحدود' باب ماجاء فی الستر علی المسلم' حدیث ۱۴۲۶۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب المواخاة' ح ۴۸۹۳۔

"جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کر رہا ہو تو اللہ اس شخص کی ضرورت پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔"

یہ تو انسانوں کا آپس میں معاملہ ہوا۔ اگر آپ اللہ کے کام میں لگ جائیں تو کیا اللہ بے مروت ہے؟ کیا خیال ہے اگر آپ اللہ کے کام میں لگ جائیں تو وہ آپ کے کاموں کو درست نہ کرے گا؟ چنانچہ نصرتِ خداوندی کے حصول کا لازمی ذریعہ کون سا ہے؟ فرمایا :

﴿ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ... ﴾ (محمد : ۷)

"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔"

تم اللہ کے دین کی نصرت میں لگ جاؤ' اس کا جھنڈا اٹھاؤ' وہ لازماً آپ کا بھلا ہی چاہے گا۔ اس کے بعد اگر میں واقعتاً اللہ کا بندہ بن جاؤں' اس کے لئے اپنے آپ کو کھپا دوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے میرے سارے کام سیدھے نہ کر دے گا۔ جب میرا کارساز ہی میری فکر میں ہے تو پھر پریشانی کیسی' اور چنتا کس چیز کی؟ اور اگر میں اپنے کام خود کروں گا تو لازماً کچھ نہ کچھ بگاڑ بیٹھوں گا۔ میرا علم کامل نہیں لہٰذا میں ٹھوکر کھاؤں گا اور نتیجتاً "فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما" بن جائے گا۔ لہٰذا سارے کام اللہ کے سپرد کر کے پرسکون ہو لینا ہی خیریت کا موجب ہے۔ اسی لئے فرمایا :

﴿ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ ﴾

(المومن : ۴۴)

قرآن حکیم کے ذریعے علاج غم و حزن

ہمارا مقام ہے عبدیت اور عبدیت کی شدت و گہرائی ہے مرتبہ ولایت' جس کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے :

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾

(یونس : ۶۲)

"آگاہ ہو جاؤ' جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

اولیاءاللہ کوئی خارجی مخلوق نہیں' بلکہ انسانوں میں سے ہیں۔ ان کے ایمان کی گہرائی بہت اتھاہ ہوتی ہے' لہٰذا نتیجہ نکلتا ہے :

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ﴾ (یونس : ۶۳'۶۴)

"جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا دنیا و آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لئے بشارتیں ہی بشارتیں ہیں۔"

لہٰذا ان کے لئے دنیا و آخرت میں بشارتیں ہی بشارتیں ہیں' ان کے لئے کسی رنج و غم اور افسوس کا سوال ہی نہیں' بلکہ ﴿ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴾ اور ﴿ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ کے مقام پر فائز ہیں۔

ایک دعا پر غور کریں جس میں مقامِ عبدیت' سپردگی' تفویض' راضی برضاءِ رب ہونے کی کیفیت اور قرآن کے ذریعے اپنے رنج و غم کے ازالے کی درخواست یکجا جمع ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : جس کسی کو کبھی بھی کوئی تکلیف ہو تو وہ اگر یہ دعا پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے غم کا ازالہ کر کے اس کی جگہ خوشی بھر دیتا ہے۔ دعا یوں ہے :

((اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ' وَابْنُ عَبْدِكَ' وَابْنُ اَمَتِكَ' نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ' مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ' عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُكَ' اَسْاَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ' سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ' اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ' اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ' اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجَلَاءَ حُزْنِیْ' وَذَهَابَ هَمِّیْ)) [۱۱]

---

(۱۱) مسند احمد ۳۹۱/۱' ح ۳۷۱۲ و ۴۵۲/۱' ح ۴۳۱۸ و الاحسان ترتیب صحیح ابن حبان ۲۵۳/۳' ح ۹۷۲ و مسند ابی یعلٰی الموصلی ۱۹۸/۹' ح ۵۲۹۷ و المعجم الکبیر للطبرانی ۱۶۹/۱۰' ح ۱۰۳۵۲ و کشف الاستار عن زوائد البزار ۳۱/۴ ح ۳۱۲۲ والمستدرك للحاکم۔ ۵۰۹/۱ علامہ الالبانی' استاذ احمد شاکر' استاذ الارناووط اور استاذ حسین سلیم اسد سب نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور معترضین کا مسکت جواب دیا ہے۔

"اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں' میرا باپ بھی تیرا ادنیٰ غلام تھا' میری ماں بھی تیری کنیز تھی' میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ میرے وجود پر تیرا ہی حکم جاری و ساری ہے۔ میرے بارے میں تیرا جو فیصلہ ہو وہ انصاف ہی انصاف ہے۔ ہر اس اسم مبارک کے واسطے سے جو تیرا ہے' جس سے تونے اپنے آپ کو خود موسوم کیا یا اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تونے وہ نام سکھایا یا خزانہ غیب میں اپنے پاس محفوظ فرمایا' ان سب ناموں کا واسطہ دے کر میں درخواست کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کو میرے دل کی بہار بنادے' میرے سینے کا نور بنادے اور میری پریشانی کو دور کرنے والا نسخہ بنادے اور میرے غم و تفکر کے ازالے کا ذریعہ بنادے"۔

عظمت قرآن پر اس سے بڑی کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ قرآن کا مقام بتمام و کمال اللہ جانتا ہے' پھر محمد رسول اللہ ﷺ جانتے ہیں ؎

"قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری!"

شعوری و غیر شعوری ایمان

شعوری ایمان :

شعوری ایمان وہ ہے جس کے ساتھ intellectual element موجود ہو' یعنی ذہنی و فکری صلاحیتوں کا اتحاد ہو۔

ایمان و یقین کا محل و مقام تو قلب ہے اور سوچ بچار کا مرکز دماغ ہوتا ہے۔ جب دل و دماغ کی سوچ ایک ہو تو وہ شعوری ایمان ہوتا ہے۔ اسی کیفیت کو قرآن حکیم نے "علیٰ وجہ البصیرۃ" کا نام دیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی زبانی اعلان کروایا گیا :

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِىْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ ﴾

(یوسف : ۱۰۸)

"تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے' میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں'

علیٰ وجہ البصیرۃ میں اور میری پیروی کرنے والے"۔

گویا نہ میں خود ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں اور نہ فلسفیوں کی طرح ظن و تخمین کے تیر چلا رہا ہوں اور نہ ہی میرا ساتھ دینے والے اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں' بلکہ ہم سب ایک واضح اور روشن راستے پر چل رہے ہیں اور ہم سب کا دل و دماغ پوری طرح مطمئن اور یکسو ہے۔

غیر شعوری ایمان :

غیر شعوری ایمان سے مراد یہ ہے کہ حقائق پر یقین تو ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی intellectual element نہیں۔ یا تو انسان کا مزاج ہی intellectual نہیں ہے' اس کی استعداد ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس نے معاملے کو علیحدہ علیحدہ رکھا ہوا ہے۔ مثلاً اگر دل مطمئن ہے تو اس پر دماغ ساتھ نہیں دے پا رہا یا دماغ بات کو پا رہا ہے تو اس پر دل نہیں ٹھک رہا۔

دل و دماغ کی علیحدہ کیفیت کو ایک مثال سے سمجھ لیں۔ میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر کمال الدین عثمانی صاحب (ایم ایس سی باٹنی) سے دریافت کیا کہ ڈارون کے نظریئے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا کہ ڈارون کے فلسفے کے دلائل تو بڑے متاثر کرنے والے (convincing) ہیں' دماغ اس پر convinced ہے لیکن دل کہتا ہے کہ کفر ہے۔ چنانچہ شعوری ایمان وہ ہے جس میں دل و دماغ دونوں متحد ہوں اور حقیقت میں یہی ایمان مطلوب ہے۔

اہم حقائق

(ا) اصل چیز یقین ہے' چاہے وہ شعوری (دلائل و شواہد کی بنیاد پر) ہو یا غیر شعوری ہو۔ مثلاً ایک شخص کو شدید پیاس لگی ہے اور فرض کر لیجئے کہ اس نے کبھی پانی نہیں پیا اور نہ اسے پانی کا پتہ ہے۔ اب اس کی جان پر جو بیت رہی ہے اس کا تو اسے علم ہے۔ اس کیفیت میں کوئی اسے پانی کا گلاس دے دیتا ہے تو اس کو پی کر اسے

یقین کامل ہو جاتا ہے کہ مجھے اسی چیز کی ضرورت تھی اور میرے اندر جو قیامت برپا تھی اس کا علاج یہی تھا' کیونکہ اس نے میری پیاس بجھادی ہے۔ اس کو یقین تو حاصل ہو گیا لیکن دلائل و شواہد کی بنیاد پر نہیں بلکہ تجربے کی بنیاد پر۔ البتہ اسے یہ معلوم نہیں کہ پانی کی کمی سے انسان کے جسم میں کیا فتور آتا ہے اور کس کس عضو پر کیا کیا قیامت بیت جاتی ہے۔

اس کے بالمقابل ایک ڈاکٹر کو معلوم ہے کہ پانی انسانی زندگی کے لئے کیوں ضروری ہے' اس کی کمی سے کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں' کس کس عضو میں کیا خرابی پیدا ہو گی' کیونکہ ڈاکٹر intellectual element رکھتا ہے' اس کا علم علیٰ وجہ البصیرۃ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ عام آدمی کو تجربے سے یقین حاصل ہوا کہ پانی پیاس بجھاتا ہے اور ڈاکٹر کو علم حقائق کے ذریعے معلوم ہوا کہ پانی پیاس بجھاتا ہے۔ چنانچہ دونوں کا یقین ایک ہی ہے کہ "پانی پیاس بجھاتا ہے"۔

(۲) آخرت میں نجات کی اصل بنیاد قلبی یقین ہے اور یہی قلبی یقین انسانی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے' چاہے یہ قلبی یقین شعوری (intellectual) ہو یا غیر شعوری (non intellectual)۔ اس اعتبار سے یہ دونوں یقین بالکل برابر ہیں' چاہے آپ اس کے دلائل جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔ فلسفہ معلوم ہو یا نہیں' کوئی فرق نہیں پڑے گا' یقین ہونا چاہئے اور بس۔

غالباً امام رازی کا یہ قول ہے : اَمُوْتُ عَلٰی عَقِیْدَۃِ عَجَائِزِ نیشابور "میں نیشاپور کی بوڑھی عورتوں کے عقیدے پر جان دے رہا ہوں" ـــــ چنانچہ اصل مطلوب یقین ہے چاہے وہ شعوری ہو یا غیر شعوری' اور یقین بہر حال انسانی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔

نوٹ : یہ صحیح ہے کہ شعوری اور غیر شعوری ایمان دنیا میں اصلاح کردار اور آخرت میں نجات کے لئے یکساں ہیں' لیکن ذہین لوگوں کی مجبوری ہے کہ ان کے سامنے علیٰ وجہ البصیرۃ والا ایمان پیش کیا جائے جو وہ قبول کر سکیں۔ یہ دورِ حاضر کی

ناگزیر ضرورت ہے۔ کیونکہ ذہین لوگ اپنی ذہنی اور طبعی ساخت کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ پہلے کوئی بات ان کے ذہن وشعور کو اپیل کرے گی تو وہ دل تک جائے گی' تب وہ مانیں گے' ورنہ ان کے دلوں پر غلاف پڑے رہیں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام دورِ حاضر کی ضرورت کیوں ہے؟ اس کے دو اسباب ہیں:

پہلا سبب : دورِ حاضر میں سائنسی معلومات(Scientific Information) کا اتنا بڑا ظہور(explosion) ہوا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ عوام بھی بند گلیوں میں تو نہیں رہتے' اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی معلومات میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔

دوسرا سبب : سمعی و بصری ذرائع ابلاغ نے جدید فلسفوں کو grass root level تک پہنچا دیا ہے۔ اب تو ایک ریڑھی بان یا ہل چلانے والا بھی استحصال جیسا ثقیل لفظ استعمال کرتا ہے۔ پہلے صرف الیکٹرک ریڈیو تھا' جہاں تک بجلی تھی وہیں تک کام کرتا تھا' پھر ٹرانزسٹر آگیا' چنانچہ ایک کمہار بھی گدھے پر جا رہا ہے تو ٹرانزسٹر ساتھ بج رہا ہے' گاؤں میں ایک آدمی ہل چلا رہا ہے اور ٹرانزسٹر ساتھ لٹکا ہوا ہے۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن ہر گاؤں میں پہنچ چکا ہے۔ لوگ چاہے ڈرامے دیکھیں یا گانے سنیں فکر تو بہرحال منتقل ہو رہی ہے۔

ان دو اسباب کے بعد اب آپ صرف عوام الناس کو بھی اس وقت تک قائل نہیں کر سکیں گے جب تک ذہین طبقے(intellectual) کی فکر پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔ چنانچہ آج کے دَور میں اس کی اشد ضرورت ہے۔ علامہ اقبال کا شعر ہے ؎

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ مَیں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل!

واقعتاً آگ کی حدت کا صحیح ادراک اسے ہی ہو سکتا ہے جو آگ میں ڈالا جائے۔ جدید فلسفوں کا مطالعہ کرنے والوں کو ہی خبر ہے کہ برٹنڈ رسل اس دنیا میں کیا کچھ کر گیا ہے'

کتنے کروڑ افراد اس کے فلسفۂ حیات سے متاثر ہوئے ہیں۔ ہمارے قدیم علماء کو کیا پتہ؟ انہوں نے تو فلسفہ پڑھا ہی نہیں۔ اگر پڑھتے بھی ہیں تو ارسطو کی منطق پڑھتے ہیں' حالانکہ جب تک اس دانش حاضر کا توڑ نہیں ہو گا ایمان کی کوئی تحریک عوامی سطح پر بھی بار آور نہیں ہو گی۔

معرفتِ ربّ

ایمان مجمل : "آمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَ صِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ" ایمان مجمل کی معراج ہے معرفتِ رب' اور بلاشبہ اس عالی مقام پر محمد رسول اللہ ﷺ فائز ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ تعلّی کی بجائے کسر نفسی سے کام لے کر کہیں ((مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ وَ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ))[۱۲] "اے اللہ! ہم تجھے نہ پہچان پائے جیسا کہ تجھے پہچاننے کا حق تھا اور نہ تیری عبادت کر پائے جیسا کہ تیری عبادت ہونی چاہئے تھی"۔ کسر نفسی کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک آدمی کوہ ہمالیہ پر بیٹھا ہے' ہمیں تو یہی نظر آ رہا ہے کہ اس سے اونچی بلندی کوئی نہیں' لیکن اسے معلوم کہ میرے اوپر اونچا آسمان بھی موجود ہے ؎

تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا
شاید وہ زمیں ہو کسی اور جہاں کی!

دوسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ نے یہ جملے جمع کے صیغے کے ساتھ اس لئے بیان کئے ہوں کہ امت کی طرف سے ترجمانی ہو جائے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ (الانعام : ۹۱' الحج : ۷۴' الزمر : ۶۷)

"اور انہوں نے اللہ کے مقام کو نہیں پہچانا جس قدر اس کے مقام کو پہچاننے کا

---

(۱۲) تلاش بسیار کے باوجود صرف اتنا جملہ ملا ہے : "مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ" ملاحظہ ہو المعجم الاوسط للطبرانی ۳۴۵/۴' ح ۳۵۹۲ تحقیق الدکتور محمود الطحان۔ (مرتب)

حق تھا"۔

دراصل روحِ انسانی میں معرفتِ رب بتمام وکمال موجود ہے اور یہی تصوف کا میدان ہے۔ اور اس روح کا تعلق باری تعالیٰ سے ہے ؎

اتصالِ بے تکیُّف بے قیاس
ہست رب النّاس را با جانِ ناس

روحِ انسانی کا تعلق واتصال ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے، لیکن ہم اس اتصال کو کسی شے پر قیاس نہیں کرسکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ـــــ **لا مثل له** ـــــ **لا مثال له ـــــ لا مثیل له اور "لیس کمثله شیء" ہے۔**

بے تکیف اور بے قیاس ہونے کے باوجود بہرحال اتصال موجود ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے حواشی میں بہت پیارا شعر نقل کیا ہے ؎

جاں نہاں در جسم ، او در جاں نہاں
اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں!

ہماری جان کا تعلق روح سے ہے اور روح کا تعلق باری تعالیٰ سے ہے۔ جان انسان کے اندر رہے اور کسی نے نہیں دیکھی، بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہے، اس کا کیا رنگ ہے، اور اس کا کتنا وزن ہے؟ دو من کی لاش میں کتنے اونس جان کا وزن ہے؟ روسی سائنس دانوں نے بڑے حساس ترازو تیار کیے اور مرنے والے مریض کو اس کے اوپر رکھ دیا۔ جان نکلنے سے عین پہلے اور بعد کا وزن کرنے کے بعد انہوں نے دعویٰ کیا کہ جان کا وزن چند اونس ہوتا ہے۔ حالانکہ مرنے کے بعد جسم کے وزن میں کمی کی کئی دوسری وجوہات بھی ہوسکتی ہیں۔

بہرحال معرفتِ رب بلکہ محبت رب روحِ انسانی کے اندر ودیعت شدہ ہے۔ یہ بات ابتدا میں گزر چکی ہے کہ آخر انسان کیوں جوابدہ ہے؟ چاہے کوئی نبی آتا یا نہ آتا ـــــ اس لئے کہ انسان کو مندرجہ ذیل صلاحیتیں دی گئی ہیں۔

(۱) سمع و بصر (۲) فواد و عقل (۳) نیکی اور بدی کی فطری تمیز (۴) روح

میں اللہ کی معرفت اور محبت ـــــ اور اسی کا نام نورِ فطرت ہے۔

ںان اور فطرتِ انسانی

ہم اپنی بول چال میں دو لفظ استعمال کرتے ہیں : (۱) جبلت و طبیعت
رت

ت و طبیعت کا تعلق حیوانی تقاضوں (animal instincts) سے ہوتا
طرت کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :
تَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ﴾ (الروم : ۳۰)
ائی ہوئی وہ فطرت جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔"
کا ہر بچہ فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل میں معرفتِ رب
الگ بات ہے کہ جب وہ غیر اسلامی ماحول میں پرورش پاتا ہے تو
ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول
مایا :

الاَّ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ ، فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ
انِهٖ)) (۱۳)

ا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی بنا دیتے
سی بنا دیتے ہیں۔"
((اَوْ یُشْرِکَانِهٖ)) "یا اسے مشرک بنا دیتے ہیں۔"

ئز، باب اذا اسلم الصبیی فمات، ح ۱۲۹۲ و ۱۲۹۳۔ و
، کل مولود یولد علی الفطرة، ح ۲۶۵۸ و دیگر

باب ہشتم

ایمانِ حقیقی کے سرچشمے

(ا) قرآن حکیم

ایمان کا سب سے بڑا منبع و سرچشمہ خود قرآن حکیم ہے۔ سورۃ الانفال میں سچے اہل ایمان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿...وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا...﴾ "اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں"۔

ان نشستوں میں یہ بات وضاحت سے سامنے آ چکی ہے کہ معرفت رب ہر انسان کے دل میں ودیعت شدہ ہے اور ضرورت صرف اسے جلا دینے یعنی activate کرنے کی ہے اور یہ صرف نورِ وحی سے ہی ممکن ہے۔ چنانچہ جب فطرتِ سلیمہ پر نورِ وحی کا نزول ہو گا تو نورِ ایمان وجود میں آ جائے گا۔

ہمارا انسانی وجود ایک مرکب وجود ہے جو جسد اور روح پر مشتمل ہے۔ ہمارے جسد خاکی کی تمام ضروریات اس زمین سے پوری ہوتی ہیں۔ لیکن ہمارا روحانی وجود عالم امر کی شے ہے اور اس کے تغذیہ و تقویت کے لئے اللہ تعالیٰ نے عالمِ بالا سے قرآن حکیم نازل کیا ہے۔ ہماری زمینی حیات کا مبدا پانی ہے اور یہی ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے۔ عالمِ حیاتیات میں جو کام پانی سرانجام دیتا ہے وہی کام عالمِ امر میں قرآن کرتا ہے۔

ہماری پوری تحریک' جدوجہد اور جستجو کا یہی فلسفہ ہے کہ قرآن حکیم ایمان و یقین کا منبع و سرچشمہ ہے اور ضرورت صرف تعلیم و تعلّم کے ذریعے اسے عام کرنے کی ہے اور اسی ذریعے سے شعوری ایمان پیدا ہو گا۔

(۲) صحبت صاحب یقین

صاحب یقین کی محفل اور صحبت اختیار کرنے سے غیر شعوری یا تقلیدی ایمان پیدا ہوگا' کیونکہ یہ خالص طبعی عمل ہے۔ مثلاً آپ آگ کے سامنے بیٹھے ہیں تو آپ کو حرارت لازماً پہنچے گی' آپ کی کوئی محنت ہے یا نہیں' نہ آپ نے دماغ لڑایا نہ آپ کا ہاتھ ہلا نہ آگ جلائی' لیکن کیونکہ آپ آگ کے پاس ہیں لہٰذا حرارت ملے گی۔ اسی طرح آپ برف کی سل کے قریب بیٹھیں تو ٹھنڈک پہنچے گی چاہے آپ خود اس کے لئے کوئی محنت کریں یا نہ کریں۔ اسی لئے قرآن حکیم مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ : ﴿ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (التوبۃ : ۱۱۹) "سچوں کے ساتھ رہو" نتیجتاً تم خود بھی سچے بن جاؤ گے۔

اور قرآن حکیم کی اصطلاح میں سچے کون ہیں؟ فرمایا:

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾ (الحجرات : ۱۵)

"مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے' پھر انہوں نے کوئی شک نہیں کیا اور انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کیا' صرف یہی لوگ (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔"

اور وہ لوگ سچے نہیں ہو سکتے جو ساری عمر تنہائی میں بیٹھ کر ضربیں ہی لگاتے رہے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نہیں نکلے۔ ان کا تصورِ دین ہی محدود ہے یا پھر فرائض دینی کا تصور ناقص ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں :

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ رسم خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری

مَیں تو اس ایمان کا قائل ہوں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان ہے یا گزشتہ صدی میں تحریک شہیدین کے لوگوں کا ایمان' یعنی سید احمد بریلوی شہید اور شاہ اسماعیل شہید

اور ان کے ساتھی (رحمھم اللّٰہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً) یہ لوگ ذکر و فکر کی حد تک تصوف کے بھی قائل تھے اور انہوں نے اس کا نام "سلسلۂ محمدیہ" تجویز کیا ہوا تھا۔ جس کا لازمی جزو تھا جہاد فی سبیل اللہ۔ اور یہ جذبہ یقین کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک عام آدمی کے لئے یقین کے مقام تک پہنچنے کے لئے "صاحب یقین" کی صحبت از حد ضروری ہے اور آسان ترین راستہ ہے۔ اس کے لئے نہ کوئی شعوری اور intellectual محنت درکار ہے اور نہ ہی کسی غیرشعوری اور non intellectual محنت کی ضرورت ہے' بس Physical قرب کی ضرورت ہے۔

(۳) عمل صالح

تقلیدی یا غیرشعوری ایمان کا دوسرا ذریعہ عمل صالح ہے۔ مثلاً ایک شخص اسلام میں داخل ہو گیا' نہ اس کے دل میں مثبت طور پر ایمان موجود ہے اور نہ ہی منفی انداز میں نفاق موجود ہے گویا کہ وہ زیرو لیول پر کھڑا ہے۔ چونکہ اس کا دھوکہ دینے یا بے ایمانی کا کوئی ارادہ نہیں ہے لہٰذا عمل صالح کے ذریعے ایمان پیدا ہو گا۔[۱]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

(الحجرات : ۱۴)

"یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لا چکے ہیں۔ (اے نبیؐ) کہہ دو تم ہرگز ایمان نہیں لائے' بس یہ کہو کہ ہم اسلام (یا اطاعت) میں داخل ہو گئے ہیں' اور ابھی تک

---

۱) شعوری ایمان کے نتیجے میں اعمالِ صالحہ پیدا ہوں گے جس طرح بیج سے درخت پیدا ہوتا ہے اور اعمال صالحہ کے ذریعے ایمان کی جڑ پیدا ہو گی جس طرح کسی درخت کی قلم لگانے سے چند دن کے بعد جڑ بن جاتی ہے اور پھر یہی جڑ اس قلم کو پروان چڑھاتی اور خوراک مہیا کرتی ہے۔ (اضافہ از مرتب)

> ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اور ہاں اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ تمہارے اعمال میں کچھ بھی کمی نہیں کرے گا' یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے"۔

تو معلوم ہوا کہ اگر دل ایمان سے خالی ہو اور ظاہری اطاعت ہو تب بھی اللہ کے ہاں اعمال ضائع نہیں ہوتے کیونکہ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور نیک اعمال کوئی بانجھ عمل نہیں ہے' بلکہ بڑا productive اور profound عمل ہے۔ صحیح نماز پڑھی جائے اور دل میں ایمان پیدا نہ ہو' یہ کیسے ممکن ہے؟ متعدد بار[۲] ایسا ہوا کہ کوئی دیہاتی' کوئی بکریاں چرانے والا' کوئی دور دراز مقام پر رہنے والا آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا : یا رسول اللہ! دین مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ یا پوچھا : میری کم سے کم ذمہ داریاں کیا ہیں؟ میں جنت میں جانا چاہتا ہوں' بس مختصر سا راستہ بتلا دیں۔ اس قسم کے سوالات کے جواب میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ "اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ' نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو' رمضان کے روزے رکھو' طاقت ہو تو حج کرلو"۔ طالب حقیقت نے اقرار کیا کہ میں یہ سب کچھ کروں گا۔ تو جب وہ شخص محفل سے ذرا دور ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا : "جس کسی نے جنتی دیکھنا ہو اسے دیکھ لے وہ جا رہا ہے"۔ جس طرح شعوری ایمان کے نتیجے میں عمل صالح پیدا ہوتا ہے اسی طرح عمل صالح کے نتیجے میں ایمان پیدا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عمل صالح کے ذریعے جو ایمان پیدا ہو گا وہ غیر شعوری (non intellectual) اور تقلیدی ہو گا۔ دورِ حاضر کے مسلمانوں کی اکثریت اس لئے مسلمان ہے کہ ان کے والدین مسلمان تھے۔ لیکن اگر انہوں نے نماز پڑھی' روزے رکھے اور دیگر نیک اعمال کئے تو ان اعمال کے ذریعے کچھ نہ کچھ ایمان پیدا ہو گا' چاہے انہیں اس کا

---

۲) صحیح ابن حبان (الاحسان)' ح ۳۴۳۸۔ ومسند البزار' ح ۲۵ و ابوداؤد' ح ۲۳۱۵۔ ومسند احمد ۳۹/۵ و ۴۰ و ۴۱ و ۵۲ و ۴۸۔ وسنن النسائی ۱۳۰/۴ ودیگر کتب حدیث۔

شعور نہ ہو' اس کے دلائل اور تفصیلات معلوم نہ ہوں' انہوں نے ذہنی محنت نہ کی ہو اور نہ ہی ایمان کی خاطر قربانی دی ہو' لیکن بہرحال عمل کے ذریعے بھی ایمان پیدا ہو گا اور ہوتا ہے۔

منزلِ ایمان کا راستہ' اسلام

سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ ذہن میں رکھیں اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو نہ مخلص مؤمن تھے اور نہ ہی دھوکہ باز منافق۔ بس کسی وجہ سے اسلام میں داخل ہو گئے۔ انہی لوگوں میں سے کچھ حضرات نے رسول اللہ ﷺ پر اس طرح کی دھونس جمانی چاہی کہ ہم بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے مسلمان ہوئے ہیں۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

﴿ يَمُنُّونَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ ﴾

(الحجرات : ١٧)

"(اے نبی) یہ لوگ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ اسلام لے آئے۔ فرما دیں : مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ دھرو بلکہ اللہ تم پر احسان دھرتا ہے کہ اس نے تم کو ایمان کا راستہ دکھایا اگر تم (اپنے دعوائے اسلام میں) سچے ہو۔"

تو آیت سے معلوم ہوا کہ ظاہری اسلام "منزلِ ایمان" کا راستہ ہے لیکن اگر معاملہ برعکس ہو اور انسان ظاہری اسلام میں بھی دغاباز اور جھوٹا ہو تو پھر یہ راستہ نفاق کی طرف جاتا ہے۔ اور نفاق کی جملہ پستیاں ہم بیان کر چکے ہیں۔

عمل صالح اور صحبت صاحب یقین سے جو ایمان پیدا ہو گا اس کا نتیجہ غیر شعوری اور تقلیدی (non intellectual) ایمان ہے۔ عوام کی عظیم اکثریت اسی ایمان کو مانتی اور جانتی ہے اور ان کے لئے یہی کفایت کرتا ہے۔

صوفیاء کا طرزِ دعوت و تزکیہ

ہمارے ہاں کے صوفیاء انہی دونوں طریقوں پر عمل کرتے تھے : (۱) صحبت جو بیعت ارشاد [۴] کی پہلی کڑی ہے۔ (۲) بھاری مشقتیں اور عملی ریاضتیں یعنی مراقبے' اشغال' تپسیائیں اور چلے وغیرہ۔ یہ سب کیا ہے؟ عمل کی شدت ہی تو ہے۔

آج کے دور میں اس طریق کار (methodology) کو تبلیغی جماعت نے بڑے پیمانے پر اختیار کیا ہے۔ "اسلام کی نشاۃ ثانیہ 'کرنے کا اصل کام" نامی کتابچے میں تجزیہ کر کے میں نے بتایا ہے کہ دورِ جدید یا عصر حاضر کی دینی تحریکوں میں کیا کمی ہے۔ میرے خیال میں ان جماعتوں کو ایمان پر جس قدر زور دینا چاہئے تھا انہوں نے نہیں دیا' بلکہ اسلام کی جدوجہد اور تحریک پر زیادہ زور دیا ہے۔

تبلیغی جماعت اور اس کا کام

دورِ حاضر کی دینی تحریکوں میں صرف "تبلیغی جماعت" نے ایمان کو موضوع بنایا ہے اور انہوں نے ایک اصطلاح ہی "ایمان کی محنت" وضع کر ڈالی ہے۔ یعنی چالیس دن کے لئے نکلو' ہمارے ساتھ رہو۔ مسجد کے ماحول میں رہنے کی برکت سے کم سے کم چالیس دن تک تو کوئی نماز قضا نہیں ہو گی' بلکہ تکبیر اولیٰ بھی نہیں چھوٹے گی۔ معاشرتی برائیوں سے بچے رہو گے' مثلاً جھوٹ' گالی گلوچ' غیبت وغیرہ وغیرہ۔ ریڈیو' ٹی وی' ٹیپ ریکارڈر وغیرہ سے نشر ہونے والی بالجبر موسیقی کی آواز سے محفوظ

---

۴) سائیں عبدالرزاق صاحب دیپال پور میں رہتے تھے جو پڑھے لکھے نہ تھے۔ سلسلۂ نقشبندیہ سے متعلق تھے لیکن عمل میں خالص اہل حدیث۔ نصف النہار کے ساتھ ہی ظہر کی نماز پڑھتے تھے۔ وہ جہری ذکر کرتے تھے جس کی لذت میں اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ چونکہ وہ روہتک ضلع حصار سے متعلق تھے لہٰذا اسی زبان میں وہ کہتے تھے: "جو دم غافل سو دم کافر"۔ گویا کہ ایمان و کفر کی یہ بھی ایک تعریف (definition) ہے۔ دوسرا جملہ وہ یہ کہتے تھے: "صحبت فرائض راکھی" یعنی صاحب یقین کی صحبت و قرب فرض رکھی گئی ہے۔ (ماخوذ)

رہو گے۔ گویا کہ یہ چلتی پھرتی خانقاہیں اور تربیت گاہیں ہیں۔ فرائض کی پابندی کے ساتھ ساتھ نفلی کام ہیں' اذکار ہیں' دعائیں ہیں' ہر موقع کی مناسبت سے مسنون دعائیں ہیں۔ عملی محنت کے طریق کار کو تبلیغی جماعت نے اس دور میں بڑے پیمانے پر اپنایا ہے۔ البتہ اس میں فکر' ذہن' سوچ کا کوئی دخل نہیں۔ آپ کیوں اور کیسے کا سوال بھی نہیں کر سکتے۔ قرآن حکیم کا صرف متن پڑھو' تلاوت کرو اور ثواب حاصل کرو۔ ترجمہ بھی مت پڑھو ـــــ اور یہیں سے میرا تبلیغی جماعت سے نقطۂ اختلاف (Point of departure) شروع ہو جاتا ہے۔

بہر حال جو کام پہلے صوفیائے کرام ڈیرہ زن قسم کی اپنی خانقاہوں اور تربیت گاہوں کے ذریعے کیا کرتے تھے وہی کام اب تبلیغی جماعت گھوم پھر کر کر رہی ہے۔ حفیظ جالندھری کا شعر ہے ؂

کیا پابند نے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

یہ طریق کار ایجاد ضرور ہے لیکن intellectual سطح پر نہیں ہے۔ بہر حال اس ذریعے سے بھی تقلیدی ایمان حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس راہ میں آنے والی ریاضتوں اور مشقتوں کو آپ نفسیاتی ریاضتیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ ذکر کی کثرت ایک auto suggestion کے درجے میں بھی آ سکتی ہے۔ یہ سارے طریق کار آج بھی جدید نفسیات میں استعمال ہو رہی ہیں۔

علامہ اقبال کا موقف اور ریاضتیں

علامہ اقبال نے کہا ہے "آج کا انسان اتنی شدید مشقتوں کا متحمل نہیں ہو سکتا جس قدر پچھلے زمانے کا انسان تھا۔ ان کی یہ بات بڑی pragmatic اور بڑی حقیقت پسندانہ ہے۔ ہم لوگ آسانیوں اور آسائشوں کے عادی ہو گئے ہیں۔ زندگیوں میں وہ مشقت نہیں رہی۔ ایک زمانہ تھا کہ سال ہا سال تک جنگلوں کی سیر ہو رہی ہے۔ ہمارے صوفیاء کے تذکرے چھپے ہوئے ہیں کہ چالیس چالیس' پچاس پچاس سال تک گزر گئے

اور ریاضتیں جاری رہیں۔

آگے چل کر علامہ اقبال کہتے ہیں کہ : "آج کے لئے کوئی اور techniques ایجاد کرنا ہوں گی"۔ میرے نزدیک علامہ کی بات صدفی صد درست ہے' کیونکہ جو بوجھ اور مشقتیں صوفیاء کرواتے تھے انہیں تو پڑھ کر ہی آدمی کانپ جاتا ہے۔ اگر ایمان کا حصول ان مشکلات و مصائب پر منحصر ہے تو ایمان بڑی نادر چیز کا نام ہے اور اس کا حصول انتہائی دشوار ہے۔

نورِ ایمان حاصل کرنے والوں کے مراتب

ذرا گہرائی سے دیکھیں تو جس قدر انسان اس دنیا میں آباد ہیں اتنے ہی راستے اللہ کی طرف جانے والے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی طبیعت اور اپنا مزاج ہے۔ اور ہر آدمی اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے راستے کا انتخاب کرے گا۔ لیکن بغرضِ تفہیم ہم ان انسانوں کو تین درجوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔

(۱) صدیقین : جس شخص کی فطرتِ صالحہ ہے یا فطرتِ سلیمہ ہے' آئینۂ قلب صاف و شفاف ہے' دل زندہ و بیدار ہے' روح بے تاب ہے' وہ جب دعوتِ ایمان قبول کرتا ہے تو اس کا شمار صدیقین میں ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : ﴿اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۝﴾ (الصّٰفّٰت : ۸۴) "جب وہ قلب سلیم لئے اپنے ربّ کے حضور پیش ہوا"۔ اس کا دل یعنی فطرت سلیم ہے اور مسخ شدہ (perverted) نہیں ہے' یا یوں کہہ لیں کہ اس پر پردے یا زنگ نہیں ہے۔ دل زندہ و بیدار ہے ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

ایسے ہی افراد کے بارے میں قرآن حکیم کہتا ہے : ﴿ لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ ﴾ (ق : ۳۷) یہ بات اس شخص کو سمجھ آئے گی جس کے پاس دل ہو۔ قلب تو سب کے پاس ہوتا ہے' مُراد ہے "قلب بیدار"۔ ہاں' واقعتاً کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کو اندر

ہی سے محسوس ہو رہا ہوتا ہے کہ حقیقت وہ نہیں جو نظر آ رہی ہے' بلکہ کچھ اور ہے۔ کنفیوشس ایک حکیم انسان تھے' ان کا جملہ ہے :

There is nothing more real than what cannot be seen and there is nothing more certain than what cannot be heard.

"جو ان آنکھوں سے دیکھی نہ جاسکے اس سے بڑی حقیقت کوئی نہیں ہے اور جو ان کانوں سے سنی نہ جاسکے اس سے زیادہ یقینی بات کوئی نہیں ہے"۔

مولانا روم ؒ کی مثنوی کے اس شعر کے مصداق کہ

"بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند"

روحِ انسانی اس زنداں خانے میں آ کر اللہ سے حجابات کی شکایت کرتی ہے۔ فطرتِ سلیمہ کے مالک' آئینۂ قلب صاف و شفاف' دل زندہ و بیدار اور روح بے تاب' یہ صدیقین کی صفات ہیں۔ ایسے لوگوں کے سامنے جونہی نورِ وحی آتا ہے قبول کر لیتے ہیں جیسے اسی کے لئے بے تاب بیٹھے تھے۔ اس زمرے میں سید الصدیقین حضرت ابوبکر الصدیق ؓ ہیں' جن کے بارے میں آپ ﷺ فرماتے ہیں :

((مَا عَرَضْتُ الْاِسْلَامَ عَلٰی اَحَدٍ اِلَّا کَانَتْ لَهٗ کَبْوَةٌ اِلَّا اَبُوْبَکْرٍ فَاِنَّهٗ لَمْ یَتَلَعْثَمْ فِیْ قَوْلِهٖ)) (۴)

"میں نے جس شخص کے سامنے بھی اسلام کی دعوت رکھی اس نے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا سوائے ابوبکر کے' انہوں نے ایک لحظہ کا بھی توقف نہیں کیا۔"

یہ توقف نہ ہونے کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ سب کچھ اندر نورِ فطرت کی صورت میں موجود تھا۔ بس آپ ﷺ نے اسے نورِ وحی کی چمک دکھائی اور وہ جاگ اٹھا۔

نورِ وحی کی خوبصورت ترین مثال قرآن حکیم میں ان الفاظ کے ساتھ بیان

---

(۴) جامع الاصول لابن اثیر ۵۸۵/۸' ح ۶۴۰۵ بحوالہ رزین و الفردوس بماثور الخطاب المعروف مسند الدیلمی ۹۳/۴' ح ۶۳۸۶ و کنز العمال ح ۳۲۶۴۳۔

ہوئی ہے :

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ﴾ (النور : ۳۵)

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ [۵] (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو' چراغ ایک فانوس میں ہو' فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا' اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی' جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے' (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں)۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے راہنمائی کرتا ہے' وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے' اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے"۔

صدیقین کے ایمان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ذاتی طور پر فطرت سلیم ' آئینۂ قلب شفاف ' روح بیدار و بے تاب ' قلب زندہ ' جیسے ہی نورِ وحی آیا جگمگا اٹھا۔ تو معلوم ہوا کہ نورِ ایمان کے دو جزو ہوئے : نورِ فطرت + نورِ وحی۔ دونوں مل گئے تو "نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ" بن گئے' اسی کے بارے میں کہا گیا ہے۔

---

۵) "آسمانوں اور زمینوں کا نور اللہ ہے" کیا معنی؟ یعنی زمین و آسمان کی کل حقیقتیں اگر کھلیں گی تو اللہ کی طرف سے آنے والے نور کے ذریعے۔ گویا کہ حقائق تک پہنچنے کی یہ کلید ہے۔ یہ بات پہلے بیان ہو چکی ہے کہ اندھیرا بے چینی و اضطراب کا سبب بنتا ہے کیونکہ آپ قرب و جوار کی اشیاء کو پہچان نہیں رہے ہوتے اور روشنی سکون کا ذریعہ ہے کیونکہ آپ اشیاء کی حقیقت کو پہچان رہے ہیں۔ اسی طرح ایمان باللہ حقائق تک رسائی کی کلید اعظم ہے۔ (ماخوذ)

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لئے
اک ذرا چھیڑ تو دے زخمۂ مضرابِ حیات

سورۂ ق کی آیت ۳۷ ہے :

﴿ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَ ہُوَ شَہِیۡدٌ ○ ﴾

"اس میں نصیحت ہے ہر اس شخص کیلئے جو دل رکھتا ہو یا جو توجہ سے بات کو سنے"۔

یہاں حرف "اَو" (بمعنی "یا") آیا ہے' واوٗ (بمعنی "اور") نہیں آیا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایمان کی تحصیل کی دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا دل بیدار ہو یا کم سے کم انسان بات کو کان لگا کر اور دھیان سے سنے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ امام ابن قیم الجوزیہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ ان کی ایک کتاب "الفوائد" ہے۔ یہ تفسیر نہیں' بلکہ مقالات کا مجموعہ ہے۔ امام ابن قیمؒ "الفوائد" میں اس آیت کے حوالے سے لکھتے ہیں :

"کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ قرآن پڑھتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ قرآن مصحف میں لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ ان کے لوحِ قلب پر لکھا ہوا ہے' گویا کہ اپنی فطرت اور قرآن میں اتنی کامل مطابقت محسوس کرتے ہیں"۔

اور یہ مقام صرف صدیقین کو حاصل ہے۔ اَللّٰھُمَّ اجۡعَلۡنَا مِنۡھُمۡ۔

(۲) <u>محجوبین</u> : دوسرے اور درمیانی درجے میں "محجوبین" آتے ہیں جن کے دل پر کچھ حجابات اور پردے ہیں' کچھ زنگ آ گیا ہے' آئینۂ دل پر گرد پڑ گئی ہے' گویا کہ "محجوب" ہو گئے ہیں' اور یہ حجابات چار قسم کے ہوتے ہیں :

(۱) عدمِ توحید۔ (۲) دنیاداری میں انہماک۔[٦]

---

٦) یعنی مشغولیت فی الدنیا۔ اور یہ ان لوگوں میں سے ہوتا ہے جو خارج کی دنیا میں دلچسپی رکھنے والے' ادھر ادھر جانے والے' کھیل کود اور تماشوں میں زندگی گزار دینے والے ہوں۔ ان لوگوں کے پاس حقائق پر غور کرنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔

(۳) اعمالِ بد کا زنگ۔[7]

(۴) خواہشاتِ سفلیہ (حب دنیا+حب مال+حب شہرت+حب جاہ)[8]

ایسے لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ افہام و تفہیم کے انداز میں انہیں کچھ سکھایا اور پڑھایا جائے اور ان کے عقلی حجابات دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ ایسے لوگوں کے لئے قرآن کا ایک اپنا طریق کار ہے۔ ایسے ہی لوگوں کو توجہ دلانے کے لئے قرآن کہتا ہے :

﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ ﴾ (آل عمران : ۱۹۰)

"یقیناً زمین و آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کو باری باری لانے میں اہل دانش کے لئے نشانیاں ہیں"۔

اسی لئے شاعر نے کہا ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اور اس قسم کی نشانیاں ہر انسان کے اندر بھی موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ ﴾ (الذاریات : ۲۱)

---

۷) اور یہ وہی لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن حکیم نے کہا ہے : ﴿ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾ (المطففین : ۱۴) "بلکہ ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ آگیا ہے"۔

۸) جب زمین میں محنت سے بامقصد زراعت نہ کی جائے تو بے ڈھنگے جھاڑ بوٹے از خود اگ آتے ہیں۔ یہی کیفیت ہوتی ہے ان لوگوں کی جنہوں نے دین کو سنجیدگی سے نہ پڑھا ہو اور ادھر ادھر کے فلسفے پڑھ لئے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی علم سے کورے ڈگری یافتہ جب غیر اسلامی فلسفہ پڑھتے ہیں تو نہ مسلمان رہتے ہیں اور نہ کافرانہ فلسفہ ہضم کرنا ان کے لئے آسان ہوتا ہے۔ (ماخوذ)

"اور زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے' اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں' کیا تم کو سوجھتا نہیں؟"

دوسری جگہ فرمانِ ربانی ہے:

﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ (فصلت/حم السجدة : ۵۳)

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے"۔

اگر حجابات بہت گہرے نہیں ہیں تو آفاقی و اَنفسی آیات پر غور کرنے سے اللہ یاد آ ہی جائے گا اور پردے دُور ہو جائیں گے ؎

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ!
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

یا ؏

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!

مختلف آفاقی نشانیوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ○ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ○ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ○ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ○ فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ○ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ○ ﴾

(الغاشية : ۱۷-۲۲)

"کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کئے گئے' اور آسمان کی طرف کہ کس طرح اونچا کیا گیا' اور پہاڑوں کی طرف کہ کس طرح گاڑ دیئے گئے اور زمین کی طرف کہ کس طرح بچھا دی گئی۔ پس آپ مسلسل نصیحت کرتے رہیں' یقیناً آپ کی ذمہ داری تو نصیحت کرنے والے کی ہے' آپ ان کے خلاف داروغہ نہیں ہیں"۔

سب سے اہم اور پہلا قدم اللہ تعالیٰ کو پہچاننا ہے' لہٰذا اب اسے یاد بھی رکھو۔ یہ ڈور کا ایک سرا ہے' اسے تھامے رکھو۔ اگر ڈور الجھ گئی تو سلجھے گی نہیں۔ اسی کا نام ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سچے طالبانِ حق کی نشانیاں اور اوصاف ان الفاظ میں بیان کیے ہیں' فرمایا :

﴿ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ ﴾ (آل عمران : ۱۹۱)

"یہ وہ لوگ ہیں جو (ہردم) اللہ کا ذکر کرتے ہیں چاہے کھڑے ہوں' چاہے بیٹھے ہوں اور چاہے اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے ہوں' اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور کرتے ہیں اور (دعا کرتے ہیں) اے ہمارے پروردگار تو نے اسے بے فائدہ پیدا نہیں فرمایا۔ تیری ذات سبحان ہے (ہر نقص و عیب سے پاک)' پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے"۔

اس منزل پر پہنچ کر مزید تدبر و غور و فکر جاری رہے تو طالب حق کا دل اس بات پر ٹھک جائے گا کہ یہ کائنات بغیر مقصد کے جاری نہیں ہے' اس کا نتیجہ نکلنا چاہیئے۔ یہ باطل نہیں ہے' بلکہ تخلیق بالحق ہے۔ ہر کام نتیجہ خیز ہے۔ اور اگر یہ ساری باتیں برحق ہیں تو ہمارے اندر جو نیکی اور بدی کا شعور اور ادراک ہے اس کا نتیجہ کہاں ہے؟ اگر یہاں گندم سے گندم اور جَو سے جَو پیدا نہیں ہو رہا' بلکہ نیکی کا الٹا نتیجہ نکل رہا ہے' تو لازماً کوئی اور عالم ہونا چاہیئے جس میں ہر کام کا صحیح حق مل سکے۔ مشہور فلاسفی کانٹ نے بہت صحیح جملہ لکھا ہے کہ خدا کی ہستی کے دو دلائل ہیں :

The stary heavens above and the moral law within

جب ایک انسان یہاں تک پہنچ گیا' اس نے آفاقی و انفسی آیات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا اور یہ بھی جان لیا کہ یہاں ہر چیز کا نتیجہ ظاہر نہیں ہو گا' یہ دنیا نامکمل ہے' اس لئے کہ یہاں اخلاقی نتائج برآمد نہیں ہو رہے تو بے اختیار کہنے لگا کہ لازماً ایک اور جہان ہونا چاہیئے۔ جو شخص اپنی عقل سے یہاں پہنچ گیا اب اگر وہ قرآن پڑھ

لے تولپک کر مانے گا کہ ہاں، یہی بات صحیح ہے۔
اس طرح کے دانشور تو اپنی فکر کے ذریعے منزلِ ایمان کے کنارے پہنچ جاتے
ہیں، نور کی ایک جھلک ان کو اپنا گرویدہ بنالیتی ہے، البتہ کچھ لوگ دلائل سننے کے بعد
مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے، فرمایا:
﴿ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا ﴾ (آل عمران: ۱۹۳)
"اے ہمارے رب! ہم نے باآوازِ بلند ایمان کی پکار لگانے والے کو سنا، وہ کہہ رہا
تھا کہ اپنے رب پر ایمان لے آؤ! چنانچہ ہم ایمان لے آئے۔"
حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے، فرمایا:
"ایک عقلی ایمان ہے جس میں سب سے پہلے اللہ کی معرفت، پھر آخرت کی
معرفت ہے۔ دوسرا سمعی ایمان ہے"۔
ان دونوں طریقوں سے ایمان مکمل ہو جاتا ہے لیکن درجہ بدرجہ مکمل ہوتا
ن کی فطرت صاف و شفاف ہو ان کو تو اتنا وقت نہیں لگتا، البتہ جن لوگوں کے
پردے پڑے ہوئے ہوں ان پر محنت کرنا ہوتی ہے، انہیں سمجھانا ہوتا ہے
پڑھانا ہوتا ہے، بلکہ کچھ وقت تک انگلی پکڑ کر چلانا ہوتا ہے۔
بیان کر چکے ہیں کہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ آج کے دور میں از
تحمل نہیں ہو سکتا جتنی کہ سابقہ دور میں خانقاہی ریاضتیں کروائی
ہلکا اور نسبتاً آسان طریق کار اختیار کرنا ہوگا۔ علامہ ا
بس کیا، البتہ میرے خیال میں اس کا آسان حل "ذکرو

(۹)

ع پر خود علامہ کے دو شعر بہت بلند مقام۔
جز بقرآں ضیغمی روباہی
فقر قرآں اصل شاہنشاہی

فقر قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر!

یہ "ذکر و فکر" ایک مجموعہ (Complex) ہے۔ ان دو عناصر میں سے اگر کسی ایک کی مقدار کم ہو تو دوسرے عنصر کی مقدار بڑھانا ہو گی۔ چنانچہ اگر فکر کی کمی ہے تو ذکر زیادہ کرنا ہو گا اور اگر ذکر مشقت ہے تو فکر کو آگے بڑھاؤ۔ دونوں ضرب کھائیں گی تو نتیجہ ایک ہی نکلے گا۔ ذہین طبقہ اگر فکر پر زیادہ زور دے گا تو ذکر کی کم مقدار بھی کفایت کر جائے گی ـــــ واللہ اعلم۔

(۳) مختومین : تیسرا اور آخری درجہ ان لوگوں کا ہے جن کی کج روی راسخ ہو چکی ہے، حجابات نہایت گہرے اور دبیز ہو چکے ہیں، دل سیاہ ہو چکے ہیں، جیسا کہ آپ ﷺ کا فرمان ہے :

((إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَخْطَأَ خَطِيئَةً نُكِتَتْ فِي قَلْبِهِ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ، فَإِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَتَابَ صُقِلَ قَلْبُهُ وَإِنْ عَادَ زِيدَ فِيهَا حَتَّى تَعْلُوَا قَلْبَهُ وَهُوَ الرَّانُ الَّذِي ذَكَرَ اللّٰهُ : ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (۹)

"جب بندہ ایک گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ لگ جاتا ہے، پھر جب وہ گناہ سے باز آ جائے اور توبہ و استغفار کرے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے، اور اگر وہ (توبہ کے بغیر) دوبارہ گناہ کرتا ہے تو اس سیاہی میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ بالآخر گناہ سارے دل کو کالا کر دیتے ہیں۔ اسی کا نام "ران" (زنگ) ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا ہے، فرمایا : "ہرگز نہیں، بلکہ ان کے کرتوتوں کی وجہ

سنن الترمذی، کتاب التفسیر، باب ۷۴، ح ۳۳۳۴۔ وسنن ابن ماجہ، کتاب الزہد،
باب ذکر الذنوب، ح ۴۲۴۴۔ والسنن الکبریٰ للنسائی ۶/۵۰۹، کتاب التفسیر
سورۃ المطففین، ح ۱۱۶۵۸۔ امام الترمذی نے حدیث کو "حسن صحیح" کہا ہے۔ علامہ الالبانیؒ
سنن الترمذی و سنن ابن ماجہ کی تحقیق میں حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے۔

سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے انہی لوگوں کے بارے میں مختلف مقامات پر مختلف انداز سے تبصرہ کیا ہے۔ فرمایا :

﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ﴾ (البقرۃ : ۷)

"اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔"

سمع و بصر اور فواد سے صلاحیتیں چھن چکی ہیں۔ ایسے لوگ روحانی طور پر مرے ہوتے ہیں۔ انذار، تبلیغ، تبشیر، وعظ اور نصیحت، کچھ بھی کارگر ثابت نہیں ہوتا، چاہے تبلیغ کرنے والے حضرت محمد ﷺ ہی کیوں نہ ہوں اور بذریعہ قرآن تبلیغ کر رہے ہوں اور سننے والا خالص عربی ہو اور قرآن کو خوب سمجھ رہا ہو، لیکن وہ دل تک اثر نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ : ۶)

"یقیناً جن لوگوں نے (جاننے اور سمجھنے کے بعد) کفر کیا نتیجہ برابر ہے خواہ آپ انہیں آگاہ کریں یا نہ کریں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔"

یہی مضمون سورۂ یٰسین آیت ۱۰ میں بھی بیان ہوا ہے۔ اس کیفیت کی تعبیر قرآن یوں بھی کرتا ہے : یہ زندہ ہیں ہی نہیں، ان کی انسانیت مر چکی ہے، روح دفن ہو چکی ہے۔ یہ چلتے پھرتے مقبرے اور تعزیے ہیں۔ فرمایا :

﴿ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

(یٰسٓ : ۷۰)

"تاکہ وہ (ہمارا نبی) اسے خبردار کر دے جو زندہ ہو۔ البتہ کافروں پر تو حق کا قول یا حجت مکمل ہو جائے گی۔"

نیز فرمایا :

﴿ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ○ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ ﴾

(النمل : ۸۰'۸۱ والرُّوم : ۵۲'۵۳)

"یقیناً اے نبی! آپ ان مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ ہی بہروں کو سنا سکتے ہیں جب وہ خود ہی مُنہ پھیر کر چل دیں۔ اور نہ ہی آپ اندھوں کو ان کی گمراہی میں ہدایت دے سکتے ہیں۔ آپ صرف ان لوگوں کو سنا سکتے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائیں' پھر وہ تابع فرمان بن کر زندگی گزاریں"(۱۰)

واضح رہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں کم سے کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔

خلاصہ بحث :

(۱) شعوری ایمان جو بالقوۃ ہر روحِ انسانی کے اندر موجود ہے اس کو صرف قرآن

---

۱۰) سنت مہجورہ : اس میں کوئی شک نہیں کہ تیسرے درجے پر پہنچنے والے لوگ شدید گمراہی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے دل مردہ اور دیگر صلاحیتیں حق کے لئے بند بلکہ مہر زدہ ہوتی ہیں۔ لیکن مبلغین' دعاۃ اور علماء کا فرض ہے کہ وہ حتی الوسع ان تک دین کی آواز پہنچانے کی کوشش کرتے رہیں۔ یہ کہہ کر جان چھڑا لینا تو بڑا آسان ہے کہ یہ گمراہ قوم ہے ان پر محنت کا کیا فائدہ؟ یہ جملہ کسی کو بھی آخرت کی جواب دہی سے نجات نہ دلا سکے گا۔ بلکہ سیرت طیبہ کا مطالعہ کر کے دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ نے آخری لمحہ حیات تک امت کو خیر پہنچانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس ضمن میں دوسری اہم سنت جس کو ہم سب بھلائے بیٹھے ہیں وہ یہ ہے کہ کافروں کی ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا کہ اے اللہ! ہمارے ان انسانی بھائیوں کو تُو اپنے فضل و کرم سے ہدایت عطا فرما۔ اس کے لئے خلوت کا وقت اور بالخصوص رات کا آخری پہر بہت مبارک وقت ہے۔ ذرا غور کریں کہ نبی ﷺ کس طرح عاجزی و انکساری کے ساتھ عام کافروں کے حق میں اور بالخصوص صاحب حیثیت حضرات کے حق میں دعا کیا کرتے تھے۔ اور ہمیں بھی اس سنت کو زندہ کرنا چاہئے۔ (اضافہ از مرتب)

کے ذریعے منوز (activate) کیا جائے گا۔ ذہین لوگوں تک ایمان پہنچانے کا صرف یہی راستہ ہے جس پر میں خود (ڈاکٹر اسرار احمد) اور پوری انجمن خدام القرآن عرصہ دراز سے کوشش و جستجو کر رہی ہے۔

(۲) جن لوگوں کے دل صاف وشفاف ہیں وہ آدمی بات سن کر ہی مکمل ایمان لے آتے ہیں۔

(۳) جن کے دلوں پر ہلکے پردے ہیں ان کو وعظ و نصیحت اور تبلیغ و تذکیر کے ذریعے ایمان تک لایا جائے۔

(۴) البتہ جن لوگوں کے دل گمراہی پر مہر زدہ ہیں ان کے بارے میں ظاہری مایوسی کے باوجود ان پر محنت جاری رکھی جائے گی اور ساتھ ساتھ اللہ کے حضور ان کی ہدایت کی خاطر دعا بھی کی جائے گی۔

آخر میں ہم سب اپنے لئے اور پوری انسانیت کے حق میں دعا کرتے ہیں :

"رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝"

نظام خلافت کیا ہے؟

- **نظامِ خلافت**' اللہ تعالیٰ کی حاکمیت مطلقہ کے اعلان و اقرار اور قرآن و سنت کی غیر مشروط بالادستی کے عملی نفاذ کا نام ہے۔
- **نظامِ خلافت**' اسلامی ریاست کے ہر شہری مسلم ہو یا غیر مسلم' کی جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہے۔
- **نظامِ خلافت**' اسلامی ریاست کے ہر شہری کی بنیادی ضروریات یعنی غذا' لباس' رہائش' علاج و تعلیم وغیرہ کا ذمہ دار ہے۔
- **نظامِ خلافت**' تمام کائنات اور انسانوں کے خالق و مالک کے ابدی پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں تک پہنچانے کا اہتمام کرتا ہے۔
- **نظامِ خلافت**' اسلامی ریاست کے تمام شہریوں کو فوری عدل و انصاف فراہم کرنے کا ضامن ہے۔
- **نظامِ خلافت**' میں مردوں اور عورتوں کے الگ الگ دائرہ کار معین ہیں۔ یہ نظام عورت کو پورا اختیار دیتا ہے کہ اللہ اور رسول ؐ کی قائم کردہ ستر و حجاب کی حدود کو پیش نظر رکھتے ہوئے بوقت ضرورت کاروبارِ حیات میں شرکت کر سکے۔
- **نظامِ خلافت**' عورتوں کی عزت و ناموس کا محافظ اور حقوق نسواں کا پاسبان ہے۔
- **نظامِ خلافت**' نہ صرف یہ کہ تمام انسانوں کی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام اس نقطۂ نگاہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنے مقصد حیات سے آگاہ ہوں' بلکہ اس کے مطابق ان کی رہنمائی اور مدد بھی کرتا ہے۔
- **نظامِ خلافت**' مسلمانوں کے دلوں میں جذبۂ جہاد کی روح بیدار کرنے کا ضامن بھی ہے تاکہ حزب الشیطان کے حملوں کا مؤثر جواب دیا جا سکے۔

خلاصہ کلام :

نظامِ خلافت کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے!